مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر و مضامین کا موضوع وار مجموعہ

تعلیم و تعلّم (حصہ اول)

جلد : ۴

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبۃ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

تعلیم و تعلّم

جلد چہارم

مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج
مولانا عنایت الرحمٰن

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.
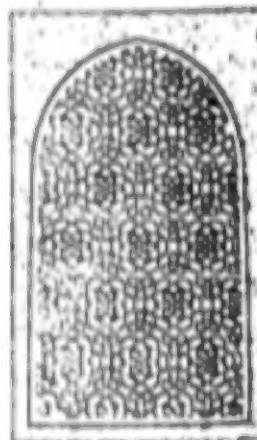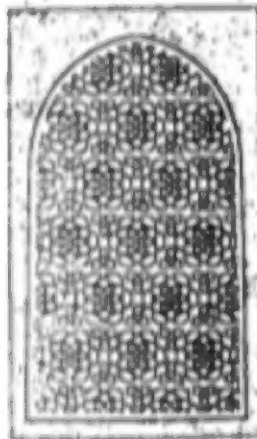
عرض ناشر الحمد للہ اگرچہ مکتبۂ معارف القرآن کراچی نے "مواعظِ عثمانی" کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔

اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

باہتمام : خضر قاسمی
طبع جدید : ذوالحجہ ۱۴۴۳ھ - جولائی ۲۰۲۲ء
ناشر : مکتبۂ معارف القرآن کراچی
ترتیب ڈیزائننگ : عمران خان
فون : (92-21) 35031565, 35123130
ای میل : info@mmqpk.com
ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com
آن لائن : fb/onlinesharia

ملنے کے پتے
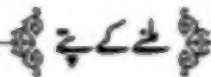
- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، کراچی / لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- فرالدین کارخانہ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدرآباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمرگرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

پیشِ لفظ
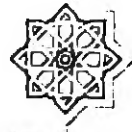
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین، وعلی کل من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت ''معارف القرآن'' کا انگریزی ترجمہ کررہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کرلیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آگیا جس کی اب غالباً ۲۵ جلدیں ہوچکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ وخطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کرکے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کردیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج وتحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماکر اس بے عمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور اس سے عام وخاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

دارالعلوم کراچی ۱۴

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۵/محرم ۱۴۴۳ھ
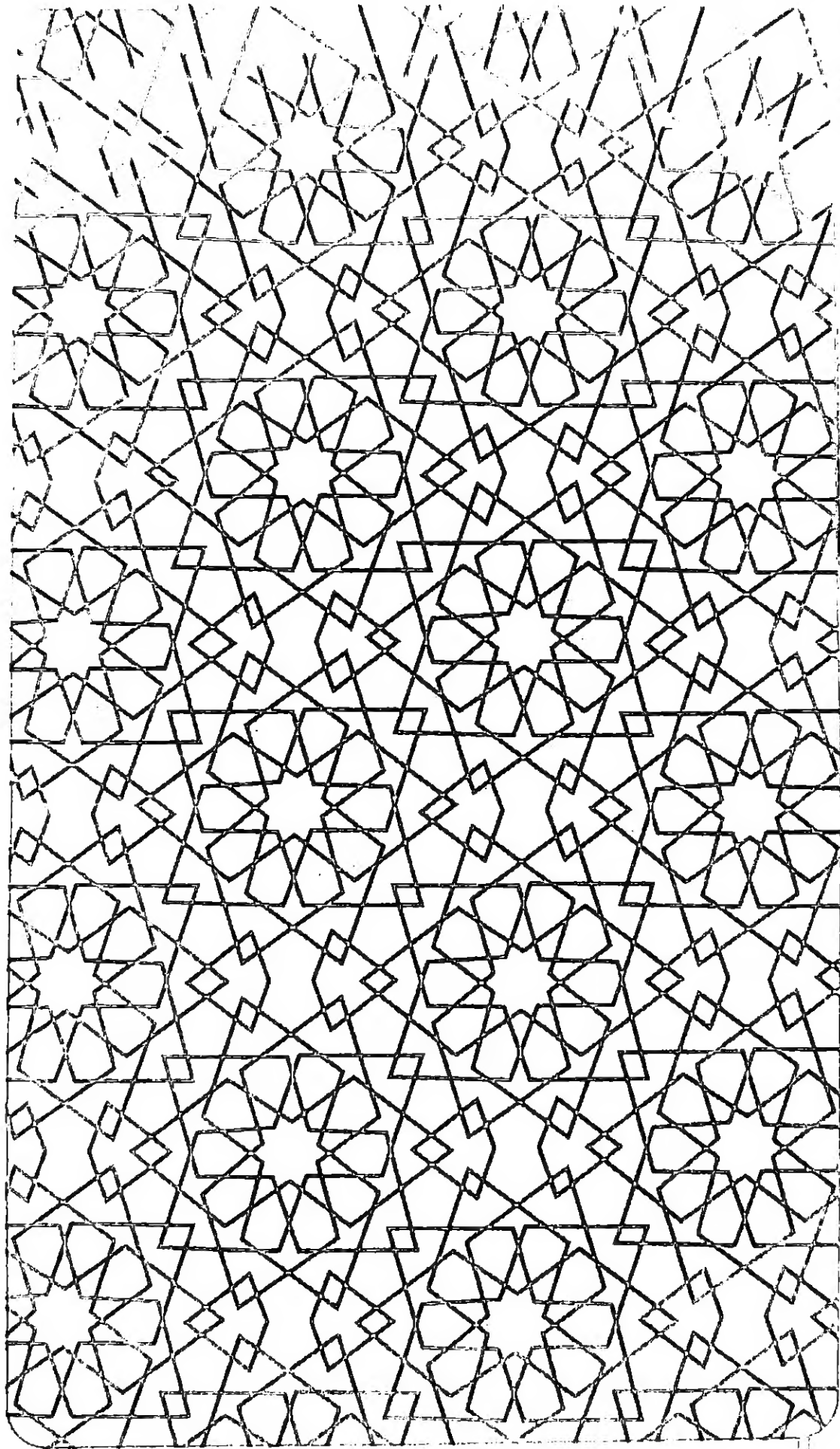
عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

زیرِ نظر کتاب سلسلہ ''مواعظِ عثمانی'' جلدِ چہارم ''تعلیم وتعلّم (حصہ اوّل)'' جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات، تقاریر اور مضامین کا تخریج شدہ جامع اور مستند موضوع وار مجموعہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ ربُّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہرِ معاشیاتِ اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعیٔ اسلام ہیں۔ اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ واری مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہورہا ہے، جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔ اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء، طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات ومواعظ تحریراً اور تقریراً عوام الناس میں مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان سے مستفید ہورہا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا	اصلاحی خطبات	اصلاحی مواعظ
اصلاحی مجالس	خطباتِ عثمانی	خطبات دورۂ ہند
درسِ شُعب الایمان	نشری تقریریں	فرد کی اصلاح
اصلاحِ معاشرہ	تربیتی بیانات	ذکر وفکر

The Islamic months

اور اس کے علاوہ

آسان ترجمہ قرآن	اسلام اور ہماری زندگی	انعام الباری
تقریرِ ترمذی	جہانِ دیدہ	سفر در سفر
دنیا مرے آگے	اسلام اور جدید معاشی مسائل	اسلام اور ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، نیز ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شائع شدہ اور صوتی صورت میں محفوظ شدہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے بعض بیانات و خطبات کو شامل کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر اس کی تصحیح اور تحقیق کا اہتمام ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات ومضامین کا جامع اور مستند ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب، تحقیق وتخریج حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر ان کی نگرانی میں مولانا عنایت الرحمن صاحب نے کی ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیات اور تحقیق وتخریج کا طریقۂ کار اس مجموعہ کی پہلی جلد ''ایمان وعقائد ونظریات (حصہ) اوّل'' کے شروع میں درج ہے، اس کی مراجعت ان شاء اللہ مفید رہے گی۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اسے ادارہ کے جملہ احباب ومعاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے۔ آمین یارب العالمین۔

خضر قاسمی (ناظم ادارہ)
مکتبہ معارف القرآن کراچی

فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرستِ عنوانات

تفصیلی فہرست

عنوان	صفحہ

عقل کا دائرہ کار

(اصلاحی خطبات ۱/۲۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقل کا دائرہ کار

الحمد للہ ربّ العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔
والصلوٰة والسلام علیٰ رسولہ الکریم۔
وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔
امّا بعد!

میرے لیے اس اکیڈمی کے مختلف تربیتی کورسز میں حاضری کا یہ پہلا موقع نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی جو تربیتی کورسز منعقد ہوتے رہے ہیں۔ ان سے بھی خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس مرتبہ مجھ سے یہ فرمائش کی گئی کہ میں ''اسلامائزیشن آف لاز'' (Islamization of Laws) کے سلسلے میں آپ حضرات سے کچھ گفتگو کروں۔ اتفاق سے ''اسلامائزیشن آف لاز'' کا موضوع بڑا طویل اور ہمہ گیر ہے اور مجھے اس وقت ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔ اس لیے وقت بھی مختصر ہے، لیکن اس مختصر سے وقت میں ''اسلامائزیشن آف لاز'' کے صرف ایک پہلو کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

''بنیاد پرست'' ایک گالی بن چکی ہے

جب یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمارا قانون، ہماری معیشت، ہماری سیاست یا ہماری زندگی کا ہر پہلو اسلام کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ڈھلنا چاہیے؟ اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ آج ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں، جس میں سیکولر تصورات (Secular Ideas) اس دنیا کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور یہ بات تقریباً ساری دنیا میں بطور ایک مسلمہ مان لی گئی ہے کہ کسی ریاست کو چلانے کا بہترین سسٹم سیکولر سسٹم (Secular System) ہے اور اسی سیکولرازم (Secularism) کے دائرے میں رہتے ہوئے ریاست کو کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں دنیا کی بیشتر ریاستیں بڑی سے لے کر چھوٹی تک، وہ نہ صرف یہ کہ سیکولر (Secular) ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں یہ آواز بلند کرنا کہ '' ہمیں اپنے ملک کو، اپنے قانون کو، اپنی معیشت اور سیاست کو، اپنی زندگی کے ہر شعبے کو اسلامائز (Islamize) کرنا چاہیے'' یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ معاشرے کو چودہ سو سال پرانے اُصولوں کے ماتحت چلانا چاہیے، تو یہ آواز آج کی اس دنیا میں اجنبی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے اور اس کو طرح طرح کے طعنوں سے نوازا جاتا ہے۔

بنیاد پرستی اور فنڈامینٹل ازم (Fundamentalism) کی اصطلاح ان لوگوں کی طرف سے ایک گالی بنا کر دنیا میں مشہور کر دی گئی ہے اور ان کی نظر میں ہر وہ شخص بنیاد پرست (Fundamentalist) ہے جو یہ کہے کہ ''ریاست کا نظام دین کے تابع ہونا چاہیے، اسلام کے تابع ہونا چاہیے۔'' ایسے شخص کو بنیاد

پرست کا خطاب دے کر بدنام کیا جارہا ہے، حالانکہ اگر اس لفظ کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو یہ کوئی بُرا لفظ نہیں تھا۔ فنڈامینٹلسٹ کے معنی یہ ہیں کہ جو بنیادی اُصولوں (Fundamental Principles) کو اختیار کرے، لیکن ان لوگوں نے اس کو گالی بنا کر مشہور کر دیا ہے۔

اسلامائزیشن کیوں؟

اس مجلس میں، میں صرف اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ ہم کیوں اپنی زندگی کو اسلامائز کرنا چاہتے ہیں؟ اور ہم ملکی قوانین کو اسلام کے سانچے میں کیوں ڈھالنا چاہتے ہیں؟ جبکہ دین کی تعلیمات چودہ سو سال بلکہ بیشتر تو ہزارہا سال پرانی ہیں۔

ہمارے پاس عقل موجود ہے

اس سلسلے میں، میں جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک سیکولر ریاست (Secular State) جس کو لا دینی ریاست کہا جائے، وہ اپنے نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی کو کس طرح چلائے؟ اس کے لیے اس کے پاس کوئی اُصول موجود نہیں ہیں، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے پاس عقل موجود ہے، ہمارے پاس مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے، اس عقل، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہماری اس دور کی ضروریات کیا ہیں؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور پھر اس کے لحاظ سے کیا چیز ہماری مصلحت کے مطابق ہے؟ اور پھر اسی مصلحت کے مطابق ہم اپنے قوانین کو ڈھال سکتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہم اس کے اندر تبدیلی لا سکتے ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں۔

کیا عقل آخری معیار ہے؟

ایک سیکولر نظامِ حکومت میں عقل، تجربے اور مشاہدے کو آخری معیار قرار دیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ معیار کتنا مضبوط ہے؟ کیا یہ معیار اس لائق ہے کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کی رہ نمائی کر سکے؟ کیا یہ معیار تنہا عقل کے بھروسے پر، تنہا مشاہدے اور تجربے کے بھروسے پر ہمارے لیے کافی ہوسکتا ہے؟

ذرائع علم

اس کے جواب کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کوئی بھی نظام جب تک اپنی پشت پر اپنے پیچھے علمی حقائق کا سرمایہ نہ رکھتا ہو، اس وقت تک وہ کامیابی سے نہیں چل سکتا اور کسی بھی معاملے میں علم حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ ذرائع عطا فرمائے ہیں۔ ان ذرائع میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص دائرہ کار ہے۔ اس دائرہ کار تک وہ ذریعہ کام دیتا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، لیکن اس سے آگے وہ ذریعہ کام نہیں دیتا اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔

''حواسِ خمسہ'' اور ان کا دائرہ کار

مثال کے طور پر انسان کو سب سے پہلے جو ذرائع عطا ہوئے وہ اس کے حواسِ خمسہ ہیں، یعنی آنکھ، کان، ناک اور زبان وغیرہ۔ آنکھ کے ذریعے دیکھ کر بہت سی چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ہاتھ کے ذریعے چھو کر حاصل ہوتا ہے، لیکن علم کے یہ پانچ ذرائع جو مشاہدے کی سرحد میں آتے ہیں، ان میں سے ہر

ایک کا ایک دائرہ کار ہے۔ اس دائرہ کار سے باہر وہ ذریعہ کام نہیں کرتا، آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن سن نہیں سکتی، کان سن سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ ناک سونگھ سکتی ہے، دیکھ نہیں سکتی۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں آنکھ تو بند کرلوں اور کان سے دیکھنا شروع کردوں تو اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ اس لیے کہ کان اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ تمہارا کان نہیں دیکھ سکتا، اس لیے کان سے دیکھنے کی تمہاری کوشش بالکل بے کار ہے۔ جواب میں وہ شخص کہے کہ اگر کان دیکھ نہیں سکتا تو وہ بے کار چیز ہے تو اس کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ اس لیے کہ وہ اتنی بات بھی نہیں جانتا کہ کان کا ایک دائرہ کار ہے، اس حد تک وہ کام کرے گا۔ اس سے اگر آنکھ کا کام لینا چاہو گے تو وہ نہیں کرے گا۔

دوسرا ذریعۂ علم ''عقل''

پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم کے حصول کے لیے یہ پانچ حواس عطا فرمائے ہیں۔ ایک مرحلے پر جاکر ان پانچوں حواس کی پرواز ختم ہوجاتی ہے۔ اس مرحلہ پر نہ تو آنکھ کام دیتی ہے، نہ کان کام دیتا ہے، نہ زبان کام دیتی ہے، نہ ہاتھ کام دیتا ہے، یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اشیاء براہِ راست مشاہدہ کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو علم کا ایک اور ذریعہ عطا فرمایا ہے اور وہ ہے ''عقل''۔ جہاں پر حواسِ خمسہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں وہاں پر ''عقل'' کام آتی ہے، مثلاً میرے سامنے یہ میز رکھی ہے، میں آنکھ سے دیکھ کر یہ بتاسکتا ہوں کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ ہاتھ سے چھو کر معلوم کرسکتا ہوں کہ یہ سخت لکڑی کی ہے اور اس پر فارمیکا لگا ہوا ہے، لیکن اس بات کا علم کہ یہ میز وجود میں

کیسے آئی؟ یہ بات میں نہ تو آنکھ سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں، نہ کان سے سن کر، نہ ہاتھ سے چھو کر بتا سکتا ہوں۔ اس لیے کہ اس کے بننے کا عمل میرے سامنے نہیں ہوا۔ اس موقع پر میری عقل میری رہ نمائی کرتی ہے کہ یہ چیز جو اتنی صاف ستھری بنی ہوئی ہے خود بخود وجود میں نہیں آسکتی۔ اس کو کسی بنانے والے نے بنایا ہے اور وہ بنانے والا اچھا تجربہ کار ماہر بڑھئی (Carpenter) ہے جس نے اس کو خوبصورت شکل میں بنایا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ اس کو کسی کارپینٹر نے بنایا ہے مجھے میری عقل نے بتائی، تو جس جگہ پر میرے حواسِ خمسہ نے کام چھوڑ دیا تھا، وہاں میری عقل کام آئی اور اس نے میری راہ نمائی کر کے ایک دوسرا علم عطا کیا۔

عقل کا دائرہ کار

لیکن جس طرح ان پانچوں حواس کا دائرہ کار لامحدود (Unlimited) نہیں تھا، بلکہ ایک حد پر جا کر ان کا دائرہ کار ختم ہو گیا تھا، اسی طرح عقل کا دائرہ کار (Jurisdiction) بھی لامحدود (Unlimited) نہیں ہے۔ عقل بھی ایک حد تک انسان کو کام دیتی ہے۔ ایک حد تک راہ نمائی کرتی ہے۔ اس حد سے آگے اگر اس عقل کو استعمال کرنا چاہیں گے تو وہ عقل صحیح جواب نہیں دے گی، صحیح راہ نمائی نہیں کرے گی۔

تیسرا ذریعہ علم ''وحی الٰہی''

جس جگہ عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے اور وہ ہے ''وحی الٰہی''۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی اور آسمانی تعلیم۔ یہ ذریعۂ علم شروع ہی اس جگہ سے ہوتا ہے

جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا جس جگہ ''وحی الٰہی'' آتی ہے، اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ آنکھ کے کام کے لیے کان کو استعمال کرنا۔ کان کے کام کے لیے آنکھ کو استعمال کرنا۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ عقل بے کار ہے، نہیں بلکہ وہ کار آمد چیز ہے، بشرطیکہ آپ کو اس کے دائرہ کار (Jurisdiction) میں استعمال کریں۔ اگر اس کے دائرہ کار سے باہر استعمال کریں گے تو یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص آنکھ اور کان سے سونگھنے کا کام لے۔

اسلام اور سیکولر نظام میں فرق

اسلام اور ایک سیکولر نظامِ حیات میں یہی فرق ہے کہ سیکولر نظام میں علم کے پہلے دو ذرائع استعمال کرنے کے بعد رُک جاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے پاس علم کے حصول کا کوئی تیسرا ذریعہ نہیں ہے، بس ہماری آنکھ، کان، ناک ہے اور ہماری عقل ہے، اس سے آگے کوئی اور ذریعۂ علم نہیں ہے اور اسلام یہ کہتا ہے کہ ان دونوں ذرائع کے آگے تمہارے پاس ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے اور وہ ہے ''وحی الٰہی''۔

وحی الٰہی کی ضرورت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ عقل کے ذریعے ساری باتیں معلوم نہیں کی جاسکتیں، بلکہ آسمانی ہدایت کی ضرورت ہے، وحی الٰہی کی ضرورت ہے، پیغمبروں اور رسولوں کی ضرورت ہے، آسمانی کتابوں کی ضرورت ہے۔ اسلام کا یہ دعویٰ ہمارے موجودہ معاشرے میں کس حد تک درست ہے؟

عقل دھوکا دینے والی ہے

آج کل عقل پرستی (Rationalism) کا بڑا زور ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر چیز کو عقل کی میزان پر پرکھ کر اور تول کر اختیار کریں گے، لیکن عقل کے پاس کوئی ایسا لگا بندھا ضابطہ (Formula) اور کوئی لگا بندھا اُصول (Principle) نہیں ہے، جو عالمی حقیقت (Universal Truth) کی حیثیت رکھتا ہو۔ جس کو ساری دنیا کے انسان تسلیم کرلیں اور اس کے ذریعے وہ اپنے خیر وشر اور اچھائی و برائی کا معیار تجویز کرسکیں۔ کون سی چیز اچھی ہے؟ کون سی چیز بُری ہے؟ کون سی چیز اختیار کرنی چاہیے؟ کون سی چیز اختیار نہیں کرنی چاہیے؟ یہ فیصلہ جب ہم عقل کے حوالے سے کرتے ہیں تو آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیے، اس میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس عقل نے انسان کو اتنے دھوکے دیے ہیں جس کا کوئی شمار اور حد و حساب ممکن نہیں۔ اگر عقل کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اس کے لیے میں تاریخ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

بہن سے نکاح خلافِ عقل نہیں

آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے عالمِ اسلام میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا۔ جس کو ''باطنی فرقہ'' اور ''قرامطہ'' کہتے ہیں۔ اس فرقے کا ایک مشہور لیڈر گزرا ہے، جس کا نام ''عبید اللہ بن حسن قیروانی'' ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کے نام ایک خط لکھا ہے وہ خط بڑا دل چسپ ہے۔ جس میں اس نے اپنے پیروکاروں کو زندگی گزارنے کے لیے ہدایات دی ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ

''میری سمجھ میں یہ بے عقلی کی بات نہیں آتی ہے کہ لوگوں

کے پاس اپنے گھر میں ایک بڑی خوبصورت، سلیقہ شعار لڑکی بہن کی شکل میں موجود ہے اور بھائی کے مزاج کو بھی سمجھتی ہے۔ اس کی نفسیات سے بھی واقف ہے، لیکن یہ بے عقل انسان اس بہن کا ہاتھ اجنبی شخص کو پکڑا دیتا ہے، جس کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ نباہ صحیح ہوسکے گا یا نہیں؟ وہ مزاج سے واقف ہے یا نہیں؟ اور خود اپنے لیے بعض اوقات ایک ایسی لڑکی لے آتے ہیں، جو حسن و جمال کے اعتبار سے بھی، سلیقہ شعاری کے اعتبار سے بھی، مزاج شناسی کے اعتبار سے بھی اس بہن کے ہم پلہ نہیں ہوتی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس بے عقلی کا کیا جواز ہے کہ اپنے گھر کی دولت تو دوسرے کے ہاتھ میں دے دے اور اپنے پاس ایک ایسی چیز لے آئے جو اس کو پوری راحت و آرام نہ دے۔ یہ بے عقلی ہے، عقل کے خلاف ہے، میں اپنے پیروؤں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس بے عقلی سے اجتناب کریں اور اپنے گھر کی دولت کو گھر ہی میں رکھیں"۔(۱)

بہن اور جنسی تسکین

اور دوسری جگہ عبید اللہ بن حسن قیروان عقل کی بنیاد پر اپنے پیروؤں کو یہ

(۱) الفرق بين الفرق وبين الفرقة الناجية لأبي منصور الاسفرائيني البغدادي ص ۲۸۱، طبع دار الآفاق الجديدة، بيروت.

پیغام دے رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ

"یہ کیا وجہ ہے کہ جب ایک بہن اپنے بھائی کے لیے کھانا پکاسکتی ہے، اس کی بھوک دور کرسکتی ہے، اس کی راحت کے لیے اس کے کپڑے سنوار سکتی ہے، اس کا بستر درست کرسکتی ہے، تو اس کی جنسی تسکین کا سامان کیوں نہیں کرسکتی؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو عقل کے خلاف ہے۔" (۱)

عقلی جواب ناممکن ہے

آپ اس کی بات پر جتنی چاہے لعنت بھیجیں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خالص عقل کی بنیاد پر جو وحی الٰہی کی راہ نمائی سے آزاد ہو، جس کو وحی الٰہی کی روشنی میسر نہ ہو، اس عقل کی بنیاد پر اس کے اس استدلال کا جواب دیں۔۔۔! خالص عقل کی بنیاد پر قیامت تک اس کے اس استدلال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

عقلی اعتبار سے بد اخلاقی نہیں

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بڑی بد اخلاقی کی بات ہے، بڑی گھناؤنی بات ہے، تو اس کا جواب موجود ہے کہ یہ بد اخلاقی اور گھناؤنا پن، یہ سب ماحول کے پیدا کردہ تصورات ہیں۔ آپ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جہاں اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے آپ اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ورنہ عقلی اعتبار سے کوئی عیب نہیں۔

---

(۱) حوالہ سابقہ۔

نسب کا تحفظ کوئی عقلی اُصول نہیں

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس سے حسب ونسب کا سلسلہ خراب ہوجاتا ہے تو اس کا جواب موجود ہے کہ نسبوں کا سلسلہ خراب ہوجاتا ہے تو ہونے دو۔ اس میں کیا برائی ہے؟ نسب کا تحفظ کون سا ایسا عقلی اصول ہے کہ اس کی وجہ سے نسب کا تحفظ ضرور کیا جائے۔

یہ بھی ہیومن ارج (HUMAN URGE) کا حصہ ہے

اگر آپ اس استدلال کے جواب میں یہ کہیں کہ اس سے طبّی طور پر نقصانات ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اب یہ تصورات سامنے آئے ہیں کہ استلذاذ بالاقارب (Incest) سے طبّی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آج مغربی دنیا کی اس موضوع پر کتابیں آرہی ہیں کہ استلذاذ بالاقارب (Incest) انسان کی فطری خواہش (Human Urge) کا ایک حصہ ہے اور اس کے جو طبّی نقصانات بیان کیے جارہے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ وہی نعرہ جو آج سے آٹھ سو سال پہلے عبید اللہ بن حسن قیروان نے لگایا تھا، اس کی نہ صرف صدائے بازگشت بلکہ آج مغربی ملکوں میں اس پر کسی طرح عمل ہورہا ہے۔

وحی الٰہی سے آزادی کا نتیجہ

یہ سب کیوں ہورہا ہے؟ اس لیے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جارہا ہے جو

عقل کے دائرہ کار (Jurisdiction) میں نہیں ہے، جہاں وحیِ الٰہی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے اور عقل کو وحی الٰہی سے آزاد کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی (Homeo Sexuality) کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر رہی ہے اور اب باقاعدہ یہ علم بن گیا ہے۔ میں ایک مرتبہ اتفاق سے نیویارک کے ایک کتب خانے میں گیا، وہاں پر پورا ایک علیحدہ سیکشن تھا، جس پر یہ عنوان لگا ہوا تھا کہ ''گے اسٹائل آف لائف'' (GAY STYLE OF LIFE) تو اس موضوع پر کتابوں کا ایک ذخیرہ آچکا ہے اور باقاعدہ ان کی انجمنیں ہیں، ان کے گروپ اور جماعتیں ہیں اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ اُس زمانے میں نیویارک کا میئر (Mayor) بھی ایک Gay تھا۔

عقل کا فریب

پچھلے ہفتے کے امریکی رسالے ٹائم کو اگر آپ اُٹھا کر دیکھیں تو اس میں یہ خبر آئی ہے کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لیے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست (Homo Sexual) تھے، لیکن اس اقدام کے خلاف شور مچ رہا ہے، مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے یہ آوازیں اُٹھ رہی ہیں کہ یہ بات کہ ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے آپ نے ان لوگوں کو فوج کے عہدوں سے برخاست کر دیا ہے، یہ بات بالکل عقل کے خلاف ہے اور ان کو دوبارہ بحال کرنا چاہیے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ تو ایک ہیومن ارج (Human Urge) ہے اور آج (Human Urge) کا بہانہ لے کر دنیا کی ہر بری بات کو جائز قرار دیا جا رہا

ہے۔ یہ سب عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے کہ بتاؤ عقلی اعتبار سے اس میں کیا خرابی ہے؟ اور یہ تو صرف جنسِ انسانی کی بات تھی، اب تو بات جانوروں، کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جا رہا ہے۔

عقل کا ایک اور فریب

بات واضح کرنے کے لیے ایک اور مثال عرض کردوں کہ یہ ایٹم بم جس کی تباہ کاریوں سے تمام دنیا آج خوف زدہ اور پریشان ہے اور ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کے طریقے تلاش کر رہی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا Encyclopaedia of Britannica میں ایٹم بم پر جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو ذرا کھول کر دیکھیں۔ اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دنیا میں ایٹم بم کا تجربہ دو جگہ پر کیا گیا ہے۔ ایک ہیروشیما اور دوسرے ناگاساکی پر اور ان دونوں مقامات پر ایٹم بم کے ذریعے جو تباہی ہوئی اس کا ذکر تو بعد میں آگے چل کر کیا ہے، لیکن اس مقالے کو شروع یہاں سے کیا گیا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم برسائے گئے، اس کے ذریعے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں اور ان کو موت کے منہ سے نکالا گیا اور اس کی منطق یہ لکھی ہے کہ اگر ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم نہ گرائے جاتے تو پھر جنگ مسلسل جاری رہتی اور اس میں اندازہ یہ تھا کہ تقریباً ایک کروڑ انسان مزید مرجاتے۔ تو ایٹم بم کا تعارف اس طرح کرایا گیا کہ ایٹم بم وہ چیز ہے جس سے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں۔

یہ اس واقعہ کا جواز (Justification) پیش کیا جا رہا ہے جس پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے کہ ان ایٹم بم کے ذریعے ہیروشیما اور ناگاساکی میں ان

بچوں کی نسلیں تک تباہ کر دی گئیں، بے گناہوں کو مارا گیا اور یہ جواز (Justification) بھی عقل کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا کوئی بُری سے بُری بات اور کوئی سنگین سے سنگین خرابی ایسی نہیں ہے، جس کے لیے عقل کوئی نہ کوئی دلیل اور کوئی نہ کوئی جواز فراہم نہ کردے۔

آج ساری دنیا فاشزم (Fascism) پر لعنت بھیج رہی ہے اور سیاست کی دنیا میں ہٹلر اور مسولینی کا نام ایک گالی بن گیا ہے، لیکن آپ ذرا ان کا فلسفہ تو اُٹھا کر دیکھیں کہ انہوں نے اپنے فاشزم (Fascism) کو کس طرح فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، ایک معمولی سمجھ کا آدمی اگر فاشزم (Fascism) کے فلسفے کو پڑھے گا تو اسے اعتراف ہونے لگے گا کہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، معقول بات ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ عقل ان کو اس طرف لے جارہی ہے۔ بہرحال! دنیا کی کوئی بد سے بدتر بُرائی ایسی نہیں ہے جس کو عقل کی دلیل کی بنیاد پر صحیح تسلیم کرنے کی کوشش نہ کی جاتی ہو۔ اس لیے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جارہا ہے جہاں اس کے استعمال کی جگہ نہیں ہے۔

عقل کی مثال

علامہ ابن خلدون جو بہت بڑے مؤرخ اور فلسفی گزرے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو عقل دی ہے وہ بڑے کام کی چیز ہے، لیکن یہ اسی وقت تک کام کی چیز ہے جب اس کو اس کے دائرے میں استعمال کیا جائے، لیکن اگر اس کو اس کے دائرے سے باہر استعمال کرو گے تو یہ کام نہیں دے گی، اور پھر اس کی ایک بڑی اچھی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال ایسی ہے جیسے سونا تولنے کا کانٹا، وہ کانٹا چند گرام سونا تول لیتا ہے اور بس اس حد تک وہ کام دیتا
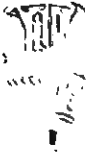
ہے اور وہ صرف سونا تولنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کانٹے میں پہاڑ تولنا چاہے گا تو اس کے نتیجے میں وہ کانٹا ٹوٹ جائے گا اور جب پہاڑ تولنے کے نتیجے میں وہ ٹوٹ جائے تو اگر کوئی شخص کہے کہ یہ کانٹا تو بے کار چیز ہے، اس لیے کہ اس سے پہاڑ تو تلتا نہیں ہے اس نے تو کانٹے کو توڑ دیا تو اسے ساری دنیا احمق کہے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس نے کانٹے کو غلط جگہ پر استعمال کیا اور غلط کام میں استعمال کیا، اس لیے وہ کانٹا ٹوٹ گیا۔(۱)

اسلام اور سیکولرازم میں فرق

اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ بے شک تم عقل کو استعمال کرو، لیکن صرف اس حد تک جہاں تک وہ کام دیتی ہے۔ ایک سرحد ایسی آتی ہے جہاں عقل کام دینا چھوڑ دیتی ہے، بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دیتی ہے، جیسے کمپیوٹر ہے، اگر آپ اس کو اس کام میں استعمال کریں جس کے لیے وہ بنایا گیا ہے تو وہ فوراً جواب دے گا، لیکن جو چیز اس کمپیوٹر میں فیڈ (Feed) نہیں کی گئی، وہ اگر اس سے معلوم کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ کمپیوٹر کام نہیں کرے گا بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دے گا۔ اسی طرح جو چیز اس عقل کے اندر فیڈ نہیں کی گئی، اس چیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے، جو وحی الٰہی ہے۔ جب وہاں عقل کو استعمال کرو گے تو یہ عقل غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔

---

(۱) تاریخ ابن خلدون ۵۸۲/۱ المقدمة/الفصل العاشر في علم الكلام-طبع دار الفكر بیروت۔

یہی وجہ ہے جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ جس کے لیے قرآنِ کریم اُتارا گیا۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی آیت ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ؕ (۱)

''ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی جس سے واقع کے موافق آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔''

یہ قرآنِ کریم آپ کو بتائے گا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ یہ سب باتیں آپ کو محض عقل کی بنیاد پر نہیں معلوم ہو سکتیں۔

آزادیٔ فکر کے علم بردار ادارے کا حال

ایک معروف بین الاقوامی ادارہ ہے۔ جس کا نام ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' ہے۔ اس کا ہیڈ آفس پیرس میں ہے۔ آج سے تقریباً ایک ماہ پہلے اس کے ایک ریسرچ اسکالر سروے کرنے کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ خدا جانے کیوں وہ میرے پاس بھی انٹرویو کرنے کے لیے آ گئے اور انہوں نے آ کر مجھ سے گفتگو شروع کی کہ ہمارا مقصد آزادیٔ فکر اور حریتِ فکر کے لیے کام کرنا ہے۔ بہت سے لوگ آزادیٔ فکر کی وجہ سے جیلوں اور قیدوں میں بند ہیں، ان کو نکالنا چاہتے ہیں اور یہ ایک ایسا غیر متنازعہ موضوع ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے، مجھے اس لیے پاکستان بھیجا گیا ہے کہ میں اس موضوع پر مختلف طبقوں

(۱) سورۃ النساء آیت (۱۰۵).

کے خیالات معلوم کروں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کا بھی مختلف اہلِ دانش سے تعلق ہے۔ اس لیے میں آپ سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

آج کل کا سروے

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ سروے کس مقصد سے کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے مختلف حلقوں میں اس سلسلے میں کیا رائے پائی جاتی ہے؟ میں نے پوچھا کہ آپ کراچی کب تشریف لائے؟ جواب دیا کہ آج صبح پہنچا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ واپس کب تشریف لے جائیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کل صبح میں اسلام آباد جارہا ہوں (رات کے وقت یہ ملاقات ہورہی تھی) میں نے پوچھا اسلام آباد میں کتنے روز قیام رہے گا؟ فرمایا کہ ایک دن اسلام آباد میں رہوں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں آپ پاکستان کے مختلف حلقوں کے خیالات کا سروے کرنے جارہے ہیں اور اس کے بعد آپ رپورٹ تیار کرکے پیش کریں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان دو تین شہروں میں دو تین دن گزارنا آپ کے لیے کافی ہوگا؟ کہنے لگے: کہ ظاہر ہے کہ تین دن میں سب کے خیالات تو معلوم نہیں ہوسکتے، لیکن میں مختلف حلقہ ہائے فکر سے مل رہا ہوں۔ کچھ لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں اور اسی سلسلے میں آپ کے پاس بھی آیا ہوں، آپ بھی میری کچھ راہ نمائی کریں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج آپ نے کراچی میں کتنے لوگوں سے ملاقات کی؟ کہنے لگے میں نے پانچ آدمیوں سے ملاقات کرلی ہے اور چھٹے آپ ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ ان چھ آدمیوں کے خیالات معلوم کرکے ایک رپورٹ تیار کردیں گے کہ کراچی والوں کے خیالات یہ ہیں۔ معاف کیجیے!

مجھے آپ کے اس سروے کی سنجیدگی پر شبہ ہے، اس لیے کہ تحقیقی ریسرچ اور سروے کا کوئی کام اس طرح نہیں ہوا کرتا ہے، اس لیے میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں، اس پر وہ معذرت کرنے لگے کہ میرے پاس وقت کم تھا، اس لیے صرف چند حضرات سے مل سکا ہوں۔ احقر نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی صورت میں سروے کا یہ کام ذمہ لینا کیا ضروری تھا؟ پھر انہوں نے اصرار شروع کردیا کہ اگرچہ آپ کا اعتراض حق بجانب ہے، لیکن میرے چند سوالات کا جواب تو آپ دے ہی دیں۔ احقر نے پھر معذرت کی اور عرض کیا کہ اس غیر سنجیدہ اور ناتمام سروے میں کسی تعاون سے معذور ہوں۔ البتہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے اس ادارے کی بنیادی فکر کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ "دراصل تو میں آپ سے سوال کرنے کے لیے آیا تھا، لیکن اگر آپ جواب نہیں دینا چاہتے تو بے شک آپ ہمارے ادارے کے بارے میں جو سوال کرنا چاہیں کریں۔"

کیا آزادئ فکر کا نظریہ بالکل مطلق (Absolute) ہے؟

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ ادارہ جس کی طرف سے آپ کو بھیجا گیا ہے، یہ آزادئ فکر کا علم بردار ہے۔ بے شک یہ آزادئ فکر بڑی اچھی بات ہے، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آزادئ فکر آپ کی نظر میں بالکل مطلق (Absolute) ہے؟ یا اس پر کوئی پابندی بھی ہونی چاہیے؟ کہنے لگے کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ آزادئ فکر کا یہ تصور کیا اتنا مطلق (Absolute) ہے کہ جو بھی انسان کے دل میں آئے وہ دوسروں کے سامنے برملا کہے اور اس کی تبلیغ کرے اور لوگوں کو اس

کی دعوت دے؟ مثلاً میری سوچ یہ کہتی ہے کہ سرمایہ داروں نے بہت دولت جمع کرلی ہے، اس لیے غریبوں کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ ان سرمایہ داروں پر ڈاکے ڈالیں اور ان کا مال چھین لیں اور میں اپنی اسی سوچ کی تبلیغ بھی شروع کردوں کہ غریب جا کر ڈاکہ ڈالیں اور کوئی ان کو پکڑنے والا نہ ہو، اس لیے کہ سرمایہ داروں نے غریبوں کا خون چوس کر یہ دولت جمع کی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ اس آزادیٔ فکر کے حامی ہوں گے یا نہیں؟

آپ کے پاس کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) نہیں؟

وہ کہنے لگے اس کے تو ہم حامی نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کہ میں یہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب آزادیٔ فکر کا تصور بالکل مطلق (Absolute) نہیں ہے، تو کیا آپ اس کو مانتے ہیں کہ کچھ قیدیں ہونی چاہیے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! کچھ قیدیں تو ہونی چاہئیں۔ مثلاً میرا خیال یہ ہے کہ آزادیٔ فکر کو اس شرط کا پابند ہونا چاہیے کہ اس کا نتیجہ دوسروں پر تشدد (Violance) کی صورت میں ظاہر نہ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ قید تو آپ نے اپنی سوچ کے مطابق عائد کردی، لیکن اگر کسی شخص کی دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ بعض اعلیٰ مقاصد تشدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتے اور ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کے نقصانات برداشت کرنے چاہئیں، تو کیا اس کی یہ آزادیٔ فکر قابلِ احترام ہے یا نہیں؟ دوسرے جس طرح آپ نے اپنی سوچ سے ''آزادیٔ فکر'' پر ایک پابندی عائد کردی، اسی طرح اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی کوئی اور پابندی اپنی سوچ سے عائد کرنا چاہے تو اس کو بھی اس کا اختیار ملنا چاہیے، ورنہ کوئی وجہ ہونی چاہیے کہ آپ کی سوچ پر عمل کیا جائے اور دوسرے کی سوچ پر عمل نہ کیا جائے، لہٰذا

اصل سوال یہ ہے کہ وہ کچھ قیدیں کیا ہونی چاہییں؟ اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ قید ہونی چاہیے؟ اور آپ کے پاس وہ معیار کیا ہے، جس کی بنیاد پر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آزادیٔ فکر پر فلاں قسم کی پابندی لگائی جاسکتی ہے اور فلاں قسم کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟ آپ مجھے کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) بتائیں، جس کے ذریعے آپ یہ فیصلہ کرسکیں کہ فلاں قسم کی پابندی جائز ہے اور فلاں قسم کی پابندی ناجائز ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ صاحب! ہم نے اس پہلو پر کبھی باقاعدہ غور نہیں کیا۔ میں نے کہا آپ اتنے بڑے عالمی ادارے سے وابستہ ہیں اور اسی کام کے سروے کے لیے آپ جارہے ہیں اور اسی کام کا بیڑہ اُٹھایا ہے، لیکن یہ بنیادی سوال کہ آزادیٔ فکر کی حدود کیا ہونی چاہییں؟ اس کا اسکوپ (Scope) کیا ہونا چاہیے؟ اگر یہ آپ کے ذہن میں نہیں ہے پھر آپ کا یہ پروگرام مجھے بار آور ہوتا نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم میرے اس سوال کا جواب آپ مجھے اپنے لٹریچر سے فراہم کردیں یا دوسرے حضرات سے مشورہ کرکے فراہم کردیں۔

انسان کے پاس وحی کے علاوہ کوئی معیار نہیں

کہنے لگے کہ آپ کے یہ خیالات اپنے ادارے تک پہنچاؤں گا اور اس موضوع پر جو ہمارا لٹریچر ہے وہ بھی فراہم کروں گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرا پھیکا سا شکریہ ادا کیا اور جلد رخصت ہوگئے۔ میں آج تک ان کے وعدے کے مطابق لٹریچر یا اپنے سوال کے جواب کا منتظر ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ قیامت تک نہ سوال کا جواب فراہم کرسکتے ہیں، نہ کوئی ایسا معیار پیش کرسکتے ہیں جو عالم گیر مقبولیت (Universally Applicable) کا حامل ہو۔ اس لیے کہ

آپ ایک معیار متعین کریں گے دوسرا شخص دوسرا معیار متعین کرے گا۔ آپ کا بھی اپنے ذہن کا سوچا ہوا معیار ہوگا۔ اس کا معیار بھی اس کے ذہن کا سوچا ہوا ہوگا اور دنیا میں کوئی شخص ایسا معیار تجویز کردے جو ساری دنیا کے لیے مکمل طور پر قابلِ قبول ہو، یہ بات میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ واقعتاً انسان کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی معیار نہیں ہے جو ان مبہم تصورات پر جائز حدیں قائم کرنے کا کوئی لازمی اور ابدی معیار فراہم کرسکے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے سوا انسان کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔

صرف مذہب معیار بن سکتا ہے

آپ فلسفہ اُٹھا کر دیکھیے۔ اس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کیا تعلق ہے؟ قانون میں ایک مکتبِ فکر ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اچھے بُرے کا تصور غلط ہے۔ نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ کوئی چیز بُری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ Should اور Should not اور Ought وغیرہ کے الفاظ درحقیقت انسان کی خواہشِ نفس کے پیدا کردہ ہیں۔ ورنہ اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس واسطے جو معاشرہ جس وقت جو چیز اختیار کرلے وہ اس کے لیے درست ہے اور ہمارے پاس اچھائی اور برائی کے لیے کوئی معیار نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری ہے اور یہ اُصول قانون پر مشہور ٹیکسٹ بک Jurisprudence میں ہے۔ اس میں اس بحث کے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے کہ

''انسانیت کے پاس ان چیزوں کے تعین کے لیے ایک

چیز معیار بن سکتی تھی، وہ ہے مذہب (Religion) لیکن چونکہ مذہب (Religion) کا تعلق انسان کی بلیف (Belief) اور عقیدے سے ہے اور سیکولر نظامِ حیات میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس واسطے ہم اس کو ایک بنیاد کے طور پر نہیں اپنا سکتے۔"

ہمارے پاس اس کو روکنے کی کوئی دلیل نہیں ہے

ایک اور مثال یاد آ گئی ہے جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا جس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ہم جنس پرستی (Homo Sexuality) کا بل تالیوں کی گونج میں پاس ہوا، اس بل کے پاس ہونے سے پہلے کافی مخالفت بھی ہوئی اور اس بل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اس مسئلے پر غور کرے کہ آیا یہ بل پاس ہونا چاہیے یا نہیں؟ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے اور فریڈمین (Fridman) کی مشہور کتاب "دی لیگل تھیوری" The Legal Theory میں اس رپورٹ کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اس کمیٹی نے ساری رپورٹ لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ

"اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چیز اچھی نہیں لگتی، لیکن چونکہ ہم ایک مرتبہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں قانون کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیے، اس لیے اس اصول کی روشنی میں جب تک ہم سن (Sin) اور کرائم (Crime) میں تفریق برقرار رکھیں گے کہ سن

اور چیز ہے اور کرائم علیحدہ چیز ہے، اس وقت تک ہمارے پاس اس عمل کو روکنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہاں، اگر سن اور کرائم کو ایک تصور کرلیا جائے تو پھر بے شک اس بل کے خلاف رائے دی جاسکتی ہے۔ اس واسطے ہمارے پاس اس بل کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے یہ بل پاس ہوجانا چاہیے۔"

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ (LAW) کو اسلامائز کیا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ سیکولر نظام نے حصولِ علم کی جو دو بنیادیں، آنکھ، کان، ناک، زبان وغیرہ اور عقل اختیار کی ہوئی ہیں، اس سے آگے ایک اور قدم بڑھا کر وحی الٰہی کو بھی حصولِ علم اور راہ نمائی کا ذریعہ قرار دے کر اس کو اپنا شعائر بنائیں۔

اس حکم کی ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتی

اور جب یہ بات ذہن میں آجائے کہ وحی الٰہی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے، تو پھر وحی الٰہی کے ذریعے قرآن وسنت میں جب کوئی حکم آجائے، اس کے بعد اس بنا پر اس حکم کو رد کرنا کہ "صاحب! اس حکم کا ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتا" احمقانہ فعل ہوگا۔ اس واسطے کہ وحی کا حکم آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں ریزن کام نہیں دے رہی تھی۔ اگر ریزن کام دے چکی ہوتی تو پھر وحی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر اس حکم کے پیچھے جو حکمتیں ہیں اگر وہ ساری حکمتیں تمہاری عقل ادراک کرسکتی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کو وحی کے ذریعے اس کا حکم دینے کی چنداں حاجت نہیں تھی۔

قرآن وحدیث میں سائنس اور ٹیکنالوجی

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی ہوگیا جو اکثر ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ صاحب! آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ساری دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کررہی ہے، لیکن ہمارا قرآن اور ہماری حدیث سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں کوئی فارمولا ہمیں نہیں بتاتا، کہ کس طرح ایٹم بم بنائیں، کس طرح ہائیڈروجن بم بنائیں۔ اس کا کوئی فارمولا نہ تو قرآن میں ملتا ہے اور نہ حدیثِ رسول ﷺ میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ صاحب! دنیا چاند اور مریخ پر پہنچ رہی ہے اور ہمارا قرآن ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ چاند پر کیسے پہنچیں؟

سائنس اور ٹیکنالوجی تجربہ کا میدان ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قرآن ہمیں یہ باتیں اس لیے نہیں بتاتا کہ وہ دائرہ عقل کا ہے۔ وہ تجربے کا دائرہ ہے۔ وہ ذاتی محنت اور کوشش کا دائرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے ذاتی تجربے عقل اور کوشش پر چھوڑا ہے کہ جو شخص جتنی کوشش کرے گا اور عقل کو استعمال کرے گا، تجربے کو استعمال کرے گا، اس میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہورہا تھا۔ عقل اس کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتی، ان چیزوں کا ہمیں قرآنِ کریم نے سبق پڑھایا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کی ہیں۔ لہٰذا اسلامائزیشن آف لاز کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع بنائیں۔

اسلام کے احکام میں لچک (Elasticity) موجود ہے

آخر میں ایک بات یہ عرض کردوں کہ جب اوپر کی بات سمجھ میں آ گئی تو پھر دل میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہم چودہ سو سال پرانی زندگی کو کیسے لوٹائیں؟ چودہ سو سال پرانے اصولوں کو آج کی بیسویں اور اکیسویں صدی پر کیسے اپلائی کریں؟ اس لیے کہ ہماری ضروریات نوع بنوع ہیں، بدلتی رہتی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی علوم سے اُنسیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام نے اپنے احکام کے تین حصے کیے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جس میں قرآن وسنت کی نصِ قطعی موجود ہے۔ جس میں قیامت تک آنے والے حالات کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہ اصول غیر متبدل ہے۔ زمانہ کیسا ہی بدل جائے، لیکن اس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے اور اس میں اس درجے کے نصوصِ قطعیہ نہیں ہیں جو زمانے کے حال پر اپلائی کریں۔ اس میں اسلامی احکام کی لچک (Elacticity) خود موجود ہے اور احکام کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہیں۔ جن کے بارے میں کوئی ہدایت اور کوئی راہ نمائی نہیں کی گئی، جن کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی حکم نہیں دیا۔ حکم کیوں نہیں دیا؟ اس لیے کہ اس کو ہماری عقل پر چھوڑ دیا ہے اور اس کا اتنا وسیع دائرہ ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی عقل اور تجربہ کو استعمال کرکے اس خالی میدان میں ترقی کرسکتا ہے اور ہر دور کی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔

ان احکام میں قیامت تک تبدیلی نہیں آئے گی

دوسرا حصہ، جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کے

اندر بھی حالات کے لحاظ سے علتوں کے بدلنے کی وجہ سے احکام کے اندر تغیر وتبدل ہوسکتا ہے۔ البتہ پہلا حصہ بے شک کبھی نہیں بدل سکتا۔ قیامت آ جائے گی لیکن وہ نہیں بدلے گا۔ اس لیے کہ وہ درحقیقت انسان کی فطرت کے ادراک پر مبنی ہے۔ انسان کے حالات بدل سکتے ہیں، لیکن فطرت نہیں بدل سکتی اور چونکہ وہ فطرت کے ادراک پر مبنی ہیں اس لیے ان میں بھی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔

بہرحال! جہاں تک شریعت نے ہمیں گنجائش دی ہے، گنجائش کے دائرے میں رہ کر ہم اپنی ضروریات کو پورے طریقے سے استعمال کرسکتے ہیں۔

اجتہاد کہاں سے شروع ہوتا ہے

اجتہاد کا دائرہ وہاں سے شروع ہوتا ہے، جہاں نصِ قطعی موجود نہ ہو۔ جہاں نص موجود ہو وہاں عقل کو استعمال کر کے نصوص کے خلاف کوئی بات کہنا درحقیقت اپنے دائرہ کار (Jurisdiction) سے باہر جانے والی بات ہے اور اسی کے نتیجے میں دین کی تحریف کا راستہ کھلتا ہے۔ جس کی ایک مثال آپ حضرات کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

خنزیر حلال ہونا چاہیے

قرآنِ کریم میں خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ حرمت کا حکم وحی کا حکم ہے۔ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا کہ صاحب! یہ کیوں حرام ہے؟ یہ عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے خنزیر کو اس لیے حرام کیا تھا کہ اس زمانے

میں خنزیر بڑے گندے تھے اور غیر پسندیدہ ماحول میں پرورش پاتے تھے اور غلاظتیں کھاتے تھے۔ اب تو خنزیر کے لیے بڑے ہائی جینک فارم (Hygenic Farm) تیار کیے گئے ہیں اور بڑے صحت مندانہ طریقے سے پرورش ہوتی ہے، لہٰذا وہ حکم اب ختم ہونا چاہیے، یہ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا ہے جہاں وہ کام دینے سے انکار کررہی ہے۔

سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟

اسی طرح ربا اور سود کو جب قرآنِ کریم نے حرام قرار دے دیا۔ بس وہ حرام ہوگیا۔ عقل میں چاہے آئے یا نہ آئے۔ دیکھیے قرآنِ کریم میں مشرکینِ عرب کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۱)

کہ بیع بھی ربا جیسی چیز ہے۔

تجارت اور بیع وشراء سے بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا سے بھی نفع کماتا ہے، لیکن قرآنِ کریم نے اس کے جواب میں فرق بیان نہیں کیا کہ بیع اور ربا میں یہ فرق ہے، بلکہ یہ جواب دیا کہ

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا

بس! اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔

اب آگے اس حکم میں تمہارے لیے چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ اس لیے

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۵).

کہ جب اللہ نے بیع کو حلال کردیا ہے تو حلال ہے اور جب اللہ نے ربا کو حرام کردیا اس لیے حرام ہے۔ اب اس کے اندر چون و چرا کرنا درحقیقت عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔

ایک واقعہ

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ہمارا ایک ہندوستانی گویّا ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا۔ حج کے بعد وہ جب مدینہ شریف جارہا تھا، راستے میں منزلیں ہوتی تھیں۔ ان پر رات گزارنی پڑتی تھی۔ ایک منزل پر جب رات گزارنے کے لیے ٹھہرا تو وہاں ایک عرب گویّا آ گیا۔ وہ بدوقسم کا عرب گویّا تھا۔ اس نے بہت بھدے انداز سے سارنگی بجا کر گانا شروع کیا۔ آواز بھدی تھی اور اس کو سارنگی اور طبلہ بھی صحیح بجانا نہیں آتا تھا، جب ہندوستانی گویّے نے اس کی آواز سنی تو اس نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گانے بجانے کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ آپ نے تو ان بدوؤں کا گانا سنا تھا۔ اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو حرام قرار نہ دیتے۔ تو اس قسم کی فکر اور تھنکنگ (Thinking) ڈیولپ (Develop) ہورہی ہے۔ جس کو اجتہاد کا نام دیا جارہا ہے۔ یہ نصوصِ قطعیہ کے اندر اپنی خواہشاتِ نفس کو استعمال کرنا ہے۔

آج کے مفکر کا اجتہاد

ہمارے ہاں ایک معروف مفکر ہیں۔ ''مفکر'' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی فیلڈ (Feild) میں ''مفکر'' (Thinker) سمجھے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی

یہ جو آیت ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا (۱)

''اور چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔''

ان مفکر صاحب نے اس آیت کی یہ تفسیر کی کہ چور سے مراد سرمایہ دار ہیں، جنہوں نے بڑی بڑی صنعتیں قائم کر رکھی ہیں اور ''ہاتھ'' سے مراد ان کی انڈسٹریاں (Industries) اور ''کاٹنے'' سے مراد ان کا نیشنلائزیشن (Nationalization) ہے، لہٰذا اس آیت کے معنی ہیں کہ سرمایہ داروں کی ساری انڈسٹریوں کو نیشنلائز کرلیا جائے اور اس طریقے سے چوری کا دروازہ بند ہوجائے گا۔

مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اس قسم کے اجتہادات کے بارے میں اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ ؎

ز اجتہادے عالمانِ کم نظر
اقتدا با رفتگاں محفوظ تر

کہ ایسے کم نظر لوگوں کے اجتہاد سے پرانے لوگوں کی باتوں کی اقتداء کرنا زیادہ محفوظ ہے ؎

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

بہرحال! میں آج کی اس نشست سے یہ فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا کہ شاید میں

(۱) سورۃ المائدۃ آیت (۳۸)۔

نے اپنے استحقاق اور اپنے اندر سے بھی زیادہ وقت آپ حضرات کا لیا ہے،
لیکن بات یہ ہے کہ جب تک "اسلامائزیشن آف لاز" کا فلسفہ ذہن میں نہ ہو،
اس وقت تک محض "اسلامائزیشن آف لاز" کے لفظ کے در و بست درست کر لینے
سے بات نہیں بنتی۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس لیے اسلامائزیشن کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ ڈنکے کی چوٹ پر، سینہ تان کر، کسی معذرت خواہی کے بغیر، کسی سے مرعوب ہوئے بغیر، یہ بات کہہ سکیں کہ ہمارے نزدیک انسانیت کی فلاح کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ صرف "اسلامائزیشن" (Islamization) میں ہے، اس کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم اور آپ کو اس کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

دو سلسلے
کتاب اللہ اور رجال اللہ

(اصلاحی خطبات ج۸ ص۳۰۹)
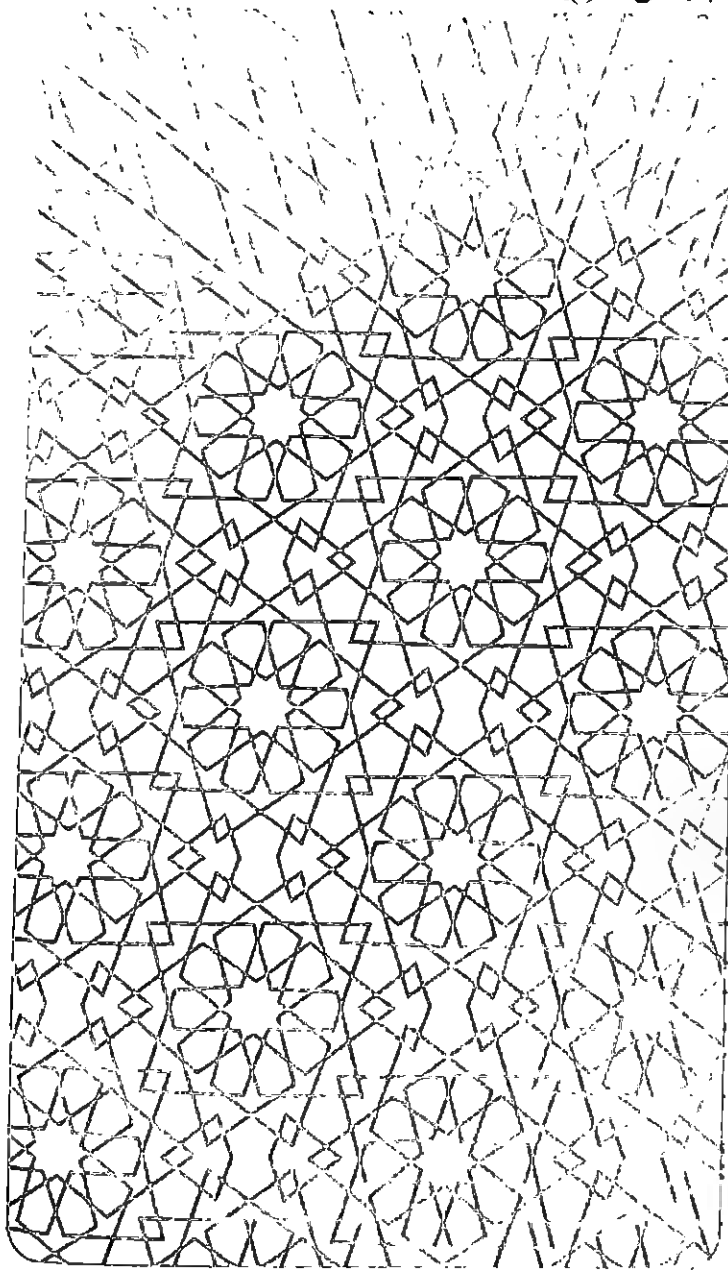
بسم اللہ الرحمن الرحیم

دو سلسلے
کتاب اللہ...... رجال اللہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا

مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۔ (۱)

امنت بالله صدق الله مولانا العظيم و صدق رسوله النبي الكريم ونحن على ذالك من الشاهدين والشاكرين والحمد لله ربّ العالمين

دو سلسلے

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی اصلاح کے لیے دو سلسلے ایک ساتھ جاری فرمائے، ایک کتاب اللہ کا سلسلہ، کتاب اللہ...... اللہ کی آسمانی کتابیں ہیں۔ یعنی تورات، زبور، انجیل اور آخر میں قرآنِ کریم نازل فرمایا۔

اور دوسرا سلسلہ رجال اللہ کا جاری فرمایا۔ رجال اللہ سے مراد انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ہے۔ یہ رجال اللہ کتاب اللہ کے ساتھ بھیجے گئے تاکہ وہ کتاب کی تشریح کریں اور اس کی عملی تربیت دیں اور کتاب کے معانی اور مفاہیم کو اپنے قول و فعل سے سمجھائیں، اس سلسلے کے لیے حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۲)

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱٦٤)۔
(۲) سورۃ النحل آیت (٤٤)۔

"ہم نے یہ ذکر اس لیے نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دیں جو کچھ کہ نازل کیا جاتا ہے۔"

رجال اللہ اس لیے بھیجے جاتے ہیں تا کہ کتاب کی تشریح کریں، تفسیر کریں اور لوگوں کی تربیت کریں۔ اسی کے بارے میں فرمایا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۱)

کسی بھی پیغمبر کے دنیا میں آنے کا بنیادی مقصد تعلیمِ کتاب ہوتا ہے، اس لیے کہ معلم کی رہ نمائی اور مفصل تفسیر کے بغیر ہم اس کتاب سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

استاد کے بغیر صرف مطالعہ کافی نہیں اور یہ صرف اللہ کی کتاب کے ساتھ ہی خاص نہیں، دنیا کے ہر علم وفن کا یہی حال ہے۔ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ میں صرف کتاب پڑھ کر مطالعہ کر کے کسی فن کا ماہر بن جاؤں، وہ نہیں بن سکتا، جب تک کہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کرے۔ جب تک استاد سے اس علم وفن کو حاصل نہ کرے، اس وقت تک اس علم وفن کا ماہر نہیں بن سکتا۔

قبرستان آباد کرے گا

علمِ طب (میڈیکل سائنس) ایک علم ہے، اس کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں،

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱٦٤)۔

ہر زبان میں موجود ہیں۔ اردو، عربی، فارسی، انگریزی میں، لیکن کوئی شخص یہ چاہے کہ گھر بیٹھے طب کی کتاب پڑھوں اور میں اس کا مطالعہ کر کے طبیب اور ڈاکٹر بن جاؤں، اگر وہ بالفرض بڑا ذہین ہے، بہت سمجھ دار ہے، قوتِ مطالعہ بہت مضبوط ہے، قابلیت بہت اعلیٰ ہے اور اس نے مطالعہ شروع کر دیا اور ان کتابوں کو سمجھ بھی گیا اور سمجھنے کے بعد لوگوں کا علاج شروع بھی کر دیا، وہ کیا کرے گا؟ وہ قبرستان آباد کرے گا۔ اس واسطے کہ باوجودیکہ اس نے کتاب سمجھ بھی لی، لیکن کسی استاد سے، معلم اور مربی سے اس کی تربیت حاصل نہ کی تو وہ طبیب نہیں بنے گا، نہ پوری دنیا میں کوئی حکومت ایسے شخص کو یہ اجازت دے گی کہ وہ انسانوں کی زندگیوں سے کھیلے، اس لیے کہ اس نے وہ طریقہ اختیار نہیں کیا جو طبیب کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے انسان کی فطرت اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ رکھی ہے کہ جب تک اس کو کوئی تربیت دینے والا تربیت نہ دے، کوئی تعلیم دینے والا تعلیم نہ دے، اس کو کوئی علم وفن اور کوئی ہنر از خود حاصل نہیں ہوگا۔

انسان اور جانور میں فرق

اللہ تعالیٰ نے جانوروں اور انسانوں میں تھوڑا فرق رکھا ہے، وہ یہ کہ جانوروں کو معلّم و مربّی کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی انسان کو ضرورت ہے، مثلاً مچھلی کا بچہ پانی کے اندر مچھلی کے انڈے سے نکلا اور نکلتے ہی اس نے تیرنا شروع کر دیا، پانی میں اس کو تیراکی سکھانے کے لیے کسی معلّم و مربّی کی ضرورت نہیں۔ خلقتاً اس کی فطرت ایسی بنادی کہ اس کو تیرنا سیکھنے کے لیے کسی دوسرے کی تعلیم وتربیت کی حاجت نہیں۔

لیکن کوئی انسان یہ سوچ کر کہ مچھلی کا بچہ بغیر کسی تعلیم وتربیت کے پانی میں تیر رہا ہے، مزے میں ہے، میں بھی اپنے بچے کو تیراکی سکھائے بغیر پانی میں پھینک دوں تو وہ شخص احمق ہوگا کہ نہیں؟ ارے انسان کا بچہ کہاں اور مچھلی کا بچہ کہاں؟ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں رکھی، لیکن تو انسان ہے، انسان کو تیراکی سیکھنے کے لیے کسی معلّم و مربّی کی ضرورت ہے۔ یا مثلاً مرغی کا بچہ انڈے سے نکلا اور نکلتے ہی اس نے دانہ چگنا شروع کر دیا، اس کو دانہ کھلانے کے لیے کسی معلّم و مربّی کی حاجت نہیں، لیکن انسان کا جو بچہ آج پیدا ہو، وہ روٹی نہیں کھائے گا، اس واسطے کہ اس کو روٹی کھلانے کے لیے کسی معلّم و مربّی کی حاجت اور ضرورت ہے، جب تک اس کو کوئی کھلانے والا کھانا سکھائے گا نہیں، اس کو ایک عملی نمونہ پیش نہیں کرے گا، اس وقت تک اس کو کھانا نہیں آئے گا۔ انسان کی فطرت اللہ نے یہ رکھی ہے کہ وہ بغیر معلّم و مربّی کے دنیا کا کوئی علم وفن اور ہنر نہیں سیکھ سکتا۔

کتاب پڑھ کر الماری بنائیے

بڑھئی کا کام ہے۔ کتاب کے اندر سب کچھ لکھا ہے کہ کس طرح میز بنتی ہے؟ کس طرح کرسی بنتی ہے؟ اور کیا کیا آلات اس میں استعمال ہوتے ہیں؟ کتاب سامنے رکھو اور الماری بناؤ! کیا اس کے طریقوں کو دیکھ دیکھ کر الماری بن جائے گی؟ ہرگز نہیں، لیکن کتاب کچھ نہ پڑھو، البتہ ایک بڑھئی کی صحبت اٹھالو اور اس کے پاس دو چار ماہ بیٹھ جاؤ، اس کو دیکھو کہ وہ کیسے بناتا ہے؟ وہ آلات کس طرح استعمال کرتا ہے تو آسانی سے الماری بنانی آجائے گی۔

کتاب سے بریانی نہیں بنتی

اور میں کہا کرتا ہوں کہ کھانا پکانے کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں۔ کھانا کیسے پکتا ہے؟ پلاؤ کیسے پکتا ہے؟ بریانی کیسے پکتی ہے؟ قورمہ کیسے پکتا ہے؟ کباب کیسے پکتے ہیں؟ سب ترتیب لکھی ہوتی ہے کہ اس کو اتنا پیسو، اس طرح اس کو بناؤ، اس میں اتنا نمک اور اتنی مرچ اتنا پانی اور اتنی فلاں چیز ڈال دو، سب اجزاء وعناصر اس کتاب میں لکھے ہوتے ہیں۔ اب اگر ایک شخص جس نے کبھی پکایا نہیں، وہ کتاب سامنے رکھ لے جو طریقہ اس میں لکھا ہے اس کے مطابق بریانی بنائے، اس کو دیکھ دیکھ کر اتنے چاول لے آئے، اتنا پانی ڈال دیا، اتنی آگ لگادی اور بنانے لگ جائے، کیا بریانی بن جائے گی؟ خدا جانے کیا ملغوبہ تیار ہوگا! کیوں؟ اس واسطے کہ کتاب سے بریانی نہیں بنتی، جب تک کہ کسی باورچی نے اس کو سکھایا نہ ہو۔

انسان کو عملی نمونے کی ضرورت

بہرحال! یہ انسان کی فطرت ہے کہ محض کتاب سے کوئی شخص کوئی علم و ہنر حاصل نہیں کرسکتا، جب تک کہ معلّم و مربّی کی تربیت نہ پائی ہو، اس کی صحبت حاصل نہ کی ہو۔ ساری دنیا کے علوم وفنون میں یہی سنت جاری ہے، جس طرح علوم وفنون میں یہ سنت ہے، اسی طرح دین میں کوئی شخص یہ چاہے کہ میں تنہا کتاب پڑھ کر اس سے دین سیکھ لوں، یاد رکھو زندگی بھر نہیں حاصل کرسکتا! جب تک کہ کسی معلم و مربی سے تربیت حاصل نہ کی ہو، اس کی صحبت نہ پائی ہو، اس کا عملی نمونہ نہ دیکھا ہو، اس وقت تک علمِ دین حاصل نہیں ہوگا۔

تنہا کتاب نہیں بھیجی گئی

یہی راز ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے تنہا کتاب کبھی نہیں بھیجی۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انبیاء علیہم السلام آئے اور کوئی نئی کتاب نہیں آئی، لیکن ایسی ایک بھی مثال نہیں کہ کتاب آئی ہو اور ساتھ کوئی نبی نہ آیا ہو، کیوں؟ اس لیے کہ اگر تنہا کتاب دی جاتی تو انسان کے اندر اتنی قابلیت نہیں تھی کہ اس کتاب کے ذریعے اصلاحِ نفس کرے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تنہا کتاب بھیجنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ دوسری طرف مشرکین کا مطالبہ بھی تھا کہ

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ(۱)

کہ ہمارے اوپر ایک مرتبہ قرآن کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل کام تھا کہ صبح کو جب بیدار ہوں تو ہر ایک آدمی کے سرہانے ایک شان دار جلد میں مجلّد قرآنِ کریم کا نسخہ رکھا ہوا ہو اور آسمان سے آواز آجائے کہ یہ کتاب ہے، اس پر عمل کرو! کیا یہ کام اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل تھا؟ مشکل نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ کام نہیں کیا، کتاب تنہا نہیں بھیجی، معلّم بھی ساتھ بھیجا، تربیت دینے والا بھی بھیجا۔ کیوں؟

کتاب پڑھنے کے لیے دونوروں کی ضرورت

اس لیے کہ کتاب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آئے گی، جب تک کہ پیغمبر کی تعلیمات کا نور ساتھ نہیں ہوگا۔ کتاب تو موجود ہے، بڑی فصیح و بلیغ بھی ہے،

---

(۱) سورۃ الفرقان آیت (۳۲).

لیکن میں اندھیرے میں بیٹھا ہوں، میرے پاس روشنی نہیں ہے، کیا میں اس کتاب سے فائدہ اُٹھاسکتا ہوں؟ نہیں! جب تک میرے پاس دو نور نہ ہوں۔ ایک تو میرے پاس آنکھ کا نور ہونا چاہیے اور دوسرا باہر سورج یا بجلی کی روشنی کا نور ہونا چاہیے۔ اگر ان میں سے ایک نور بھی مفقود ہو تو کتاب سے فائدہ نہیں اُٹھاسکتا، مثلاً باہر سورج کی روشنی ہے، سورج نکلا ہوا ہے اور آنکھ میں نور نہیں ہے تو کیا میں کتاب پڑھ سکوں گا؟ یا مثلاً آنکھ میں نور ہے باہر نور نہیں ہے۔ نہ سورج کی روشنی، نہ چراغ کی، نہ بجلی کی روشنی، کیا میں کتاب پڑھ سکوں گا؟ نہیں، اس لیے کہ کتاب کو پڑھنے کے لیے دونوروں کی ضرورت ہے ایک اپنے اندر کا نور اور ایک باہر سورج یا بجلی کا نور، ایک داخلی نور اور ایک خارجی نور، دونوں نور جب ہوں گے تب کتاب سے استفادہ ہوسکے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے جاری فرمائے ایک کتاب اللہ کا اور دوسرا رجال اللہ کا۔

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ کا نعرہ

یہیں سے ساری گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک فرقہ ہے اس نے کہا:

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه

یہ بڑا دل کش نعرہ لگایا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ دیکھنے میں تو بڑی اچھی بات معلوم ہوئی ہے۔ اللہ کی کتاب تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[1] ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے، لیکن اس نعرہ لگانے والوں سے پوچھو کہ فن طب کی

---

(۱) سورة النحل آیت (۸۹).

کتاب گھر میں موجود ہے، جس میں طب کے مضمون ہیں، لیکن اس کے پاس استاد کی تعلیم کا نور نہ ہوگا تو یہ کتاب بے کار ہوگی۔ اسی طرح صرف کتاب اللہ کو لے کر یہ کہنا کہ ہمیں پیغمبر کی تعلیمات کی حاجت نہیں۔ معاذ اللہ یہ اندھا پن اور گمراہی ہے۔

بہرحال! ایک گروہ تو وہ ہے جو کتاب کو چمٹ گیا اور رجال اللہ یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کو چھوڑ دیا اور گمراہی کی غار میں گرا۔ حقیقت میں رجال اللہ کو چھوڑنے سے کتاب کو چھوڑ دیا، کیونکہ خود کتاب کہہ رہی ہے کہ ہمارے رجال کو دیکھو، ہم نے ان کو معلّم بنا کر بھیجا۔ ہم نے ان کو نبی بنا کر بھیجا۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں کتاب کو پکڑتا ہوں اور رجال کو چھوڑتا ہوں وہ حقیقت میں کتاب ہی کو نہیں پکڑتا۔ طب کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ”بغیر طبیب کے مشورے کے دوائیں مت کھانا“ اب اگر اس کتاب کو پڑھ کر وہ بات تو بھول گئے اور ساری کتابیں پڑھیں، جس میں ہر مرض کی دوا لکھی ہے اور اپنی مرضی سے اپنا علاج شروع کر دیا، نتیجہ کیا نکلے گا؟ کہ کل کے بجائے آج ہی مرے گا، ایسا ہی معاملہ ہے ان لوگوں کا جو ”حسبنا کتاب الله“ کا نعرہ لگا کر رجال اللہ سے لوگوں کو برگشتہ کرتے ہیں۔

صرف رجال بھی کافی نہیں

دوسرے گمراہ لوگ وہ ہیں کہ رجال اللہ میں ایسے گم ہوئے کہ کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور یہ کہنے لگے کہ ہمیں تو رجال کافی ہیں۔ ہم نہیں جانتے کتاب اللہ کیا ہوتی ہے اور بس جو رجال اپنے مطلب کے سمجھ میں آئے، ان کو اپنا

مقتدا بنالیا، ان کی پرستش شروع کردی۔ یہ نہ دیکھا کہ کتاب نے کیا کہا تھا؟ صرف رجال اللہ کو پکڑ کر بیٹھ گئے، کتاب اللہ کو چھوڑ دیا، یہ دوسری گمراہی میں داخل ہیں۔

مسلکِ معتدل

مسلکِ اعتدال یہ ہے کہ کتاب اللہ کو بھی پکڑو اور رجال اللہ کو بھی پکڑو، کتاب اللہ کو رجال اللہ کی تعلیم وتربیت کی روشنی میں پڑھو تو ہدایت کا راستہ پالوگے، دونوں چیزوں کو جمع کرنے کے بارے میں حضور ﷺ نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ

"ما أناعليه وأصحابی"(۱)

"ما أناعليه" سے مراد کتاب اور "اصحابی" سے مراد رجال یعنی یہ کتاب جس پر میں ہوں اس کو پکڑ لینا اور میرے اصحاب کو پکڑ لینا۔ جو شخص دونوں چیزیں ایک ساتھ لے کر چلے تب ہدایت پائے گا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے تو آج کی فنی، نظریاتی اور عملی گمراہیوں کا سدّ باب ہوجائے۔ جتنے لوگ کتابوں کا مطالعہ کرکر کے دینی رہنما بن گئے، کتابوں کا مطالعہ کرلیا تو کہہ دیا کہ ہم بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور نعرہ لگادیا کہ

"هم رجال ونحن رجال"

ہم بھی انسان اور وہ بھی انسان اور میں بھی وہی کام کروں گا جو وہ کررہے تھے، انہوں نے جس طرح قرآن وحدیث سے اجتہاد کرکے مسائل بتائے، میں

---

(۱) سنن الترمذی ۳۸۱/٤ (۲٦٤١) وقال هذا حديث مفسر غريب لا نعرفه مثل هذا الا من هذا الوجه۔ طبع دار الجيل بيروت۔

بھی بتاؤں گا تو حقیقت میں یہ شخص گمراہ ہے اور اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک طفلِ مکتب کھڑا ہو اور ڈاکٹروں کے بارے میں کہے کہ "ھم رجال ونحن رجال" کہ یہ ڈاکٹر ہماری طرح کا انسان ہے، وہ اگر آپریشن کرتا ہے میں بھی کروں گا۔ وہ اگر لوگوں کو کاٹتا ہے تو میں بھی کاٹوں گا۔ ارے احمق! وہ تو کاٹتا ہے صحت حاصل کرنے کے لیے، طریقے سے کاٹتا ہے۔ تو کاٹے گا تو ذبح کرے گا، لیکن نعرہ بھی لگا رہا ہے "ھم رجال ونحن رجال"۔ تو رجال اللہ کو چھوڑ کر جو نعرے آج کل لگتے ہیں، مطالعہ کے بل پر اور استاد سے پڑھے اور سیکھے بغیر دین کو حاصل کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، وہ درحقیقت بڑی گمراہی میں ہیں۔

اگر بالفرض ایسا آدمی جو ذہین ہے، اس نے طب کی کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں لکھا کہ فلاں مرض کا علاج یہ ہوتا ہے، فلاں مرض کا یہ علاج ہے اور اس کے بعد اس نے اپنا مطب کھول لیا اور دس آدمیوں کا علاج کیا، ان کو فائدہ ہوگیا! اب لوگ کہنے لگے کہ اس کے علاج میں بڑا فائدہ ہوتا ہے، یہ تو بڑا زبردست ڈاکٹر ہے، لوگ اس کے پیچھے لگ گئے، لیکن لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ دس آدمیوں کو اگر فائدہ ہوا تو وہ فائدہ ایک طرف، اگر ایک جان چلی گئی تو وہ نقصان ایک طرف! کل کو وہ اناڑی پن میں کوئی ایسا کام کرے گا جو اس کی جان لے بیٹھے گا، لہٰذا صرف یہ دیکھ کر کہ دس آدمیوں کو فائدہ پہنچا، کسی اناڑی کسی غیر ماہر، کسی غیر تربیت یافتہ شخص کے پیچھے لگ جانا عقل مندی نہیں ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ہر وقت خطرہ ہے کہ کب گڑبڑ کر جائے اور کسی انسان کی جان لے بیٹھے۔ بڑے نعرے لگتے ہیں کہ صاحب فلاں کی کتاب پڑھ کر لوگ بڑے دین پر

آ گئے، پہلے بے دین تھے، اب دین دار ہو گئے، نماز نہیں پڑھتے تھے اب نماز پڑھتے ہیں، اللہ سے غافل تھے اللہ کے قریب آ گئے، وہ تو آدمی اچھا ہے، یہ مولوی لوگ بلاوجہ کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے مت جاؤ، اس کی کتاب مت پڑھو۔ ارے بھائی! ہم نے دیکھا، کتابیں پڑھیں، بہت فائدہ ہوا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس کی مثال وہی ہے جو میں نے دی ہے کہ ایک آدمی غیر تربیت یافتہ طب کی کتابوں کا مطالعہ کر کے آئے، آٹھ دس آدمیوں کا علاج کر لیا، ان کو فائدہ ہو گیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ ڈاکٹر بن گیا اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو کہہ دیا کہ تم اس سے علاج کروایا کرو۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کسی وقت گڑبڑ کرے گا اور تمہاری جان لے لے گا۔ اسی طرح یہ شخص بھی جو صرف کتابیں پڑھ کر لوگوں کو دین سکھا رہا ہے اور لوگوں کو اس سے فائدہ ہو رہا ہے، اس کے فائدے سے دھوکے میں نہ آنا چاہیے۔ اس لیے کہ کسی بھی وقت کوئی بات ایسی کرے گا جس سے کہ تمہارا دین خراب ہو جائے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ دین کس طرح سیکھا؟

اس دین کی اللہ نے فطرت یہ بنائی ہے کہ یہ سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوتا ہے۔ یہ آنکھ سے کتاب کو پڑھ لینے سے نہیں آتا، پڑھانے والے کے سینے سے پڑھنے والے کے سینے میں منتقل ہوتا ہے۔ کیا حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کوئی کتاب پڑھی؟ کوئی ڈگری لی؟ کوئی سند حاصل کی؟ کچھ نہیں کیا، بلکہ صفہ میں جا کر پڑ گئے، نہ کوئی نصاب ہے، نہ کوئی گھنٹہ (Period) ہے۔

وہاں کیا کرتے تھے؟ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال دیکھا کرتے تھے کہ

آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا فرما رہے ہیں؟ ان کو دیکھ دیکھ کر تعلیماتِ نبوی کا نور ان کے دلوں میں آ گیا، پھر اس طرح تابعین پھر تبع تابعین سے لے کر آج تک علم دین سیکھنے کا یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے اور یہ جو ہم پڑھتے ہیں:

"قال حدثنا فلان حدثنا فلان"

یہ سب سند ہے، وہ شجرۂ طیبہ ہے جس سے ہمارا رشتہ ایمان جا کر سیدھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ واسطے کے ذریعے عطا فرماتے ہیں

ایک کتاب ہے، اب اس کتاب کو پڑھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کا خود مطالعہ کریں اور جو کوئی لفظ سمجھ میں نہ آئے تو لغت میں دیکھ لیں، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہی کتاب استاد کے سامنے بیٹھ کر پڑھیں، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ حالانکہ مطالعے کے دوران جو بات سمجھ میں آئی تھی استاد صاحب نے بھی وہی بتائی ہو، کوئی فرق نہ ہو، پھر بھی جو استاد سے سنی ہوئی بات ہوگی اس میں جو نور ہوگا، اس میں جو برکت ہوگی، اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم کی تجلیات ہوں گی، وہ کبھی مطالعے سے حاصل نہیں ہوں گی۔ وجہ یہ ہے کہ استاد کوئی چیز نہیں ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ وہ جب دیتا ہے تو واسطے سے دیتا ہے۔ حتیٰ کہ انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی واسطے سے دیتا ہے۔ کیا اللہ قادر نہیں تھا کہ براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرما دیتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ جبرائیل امین کو واسطہ بنایا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت کی تب

بھی ایک درخت کو واسطہ بنادیا۔ یعنی شجرہ طور کو، اس میں کیا مصلحت اور کیا حکمت؟ وہ جانے اس کی حکمتیں جانیں، لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ جب دینا ہوتا ہے تو کسی واسطے سے دیتا ہے، چاہے یہ واسطہ بے جان ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ یہ درخت اور اپنی تجلّی فرمانی چاہی تو براہِ راست نہیں فرمائی بلکہ کوہِ طور پر تجلّی فرمائی۔ اس کو واسطہ بنادیا حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، اسی طرح استاد کی کوئی حقیقت نہیں، مگر اس کو واسطہ بنادیا۔ یہ اس کی سنت ہے۔ دینے کا طریقہ بتادیا کہ اگر لینا ہے تو اس طرح لو، مثلاً یہ کھڑکی دیکھیے، اس سے سورج کی دھوپ اور روشنی آرہی ہے کیا یہ کھڑکی روشنی کو پیدا کررہی ہے کہ کھڑکی روشنی کی علت بن گئی ہو؟ نہیں! روشنی تو درحقیقت باہر سے آرہی ہے، لیکن یہ کھڑکی واسطہ بن گئی ہے۔ اسی طرح یہ استاذ واسطہ ہے اگرچہ اس کی ذات کا علم کی روشنی میں دخل نہیں، لیکن ہمیں روشنی پہنچنے میں اس کی مدد ملتی ہے۔ اس وجہ سے استاد کی قدر و منزلت کا رواج ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے واسطہ بنایا ہے۔

بہرحال! میں جو کہہ رہا ہوں اگرچہ کتاب اللہ نمبر ایک ہے اور حدیث نمبر دو پر ہے، لیکن ہمارے لیے عملی نقطۂ نظر سے ترتیب یہ ہے کہ حدیث سے پہلے گزریں گے، تب کتاب اللہ تک پہنچیں گے، کیونکہ اس کے بغیر ہم کتاب اللہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے علمِ حدیث جس کا ہم آج آغاز کررہے ہیں جو ہمارے تمام علوم مقصودہ کا مادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ پڑھنے، پڑھانے اور پورے آداب کے ساتھ علم حدیث حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین

غیر ضروری سوالات سے پرہیز کیجیے

(اصلاحی خطبات ج ۷ ص ۲۹۳)
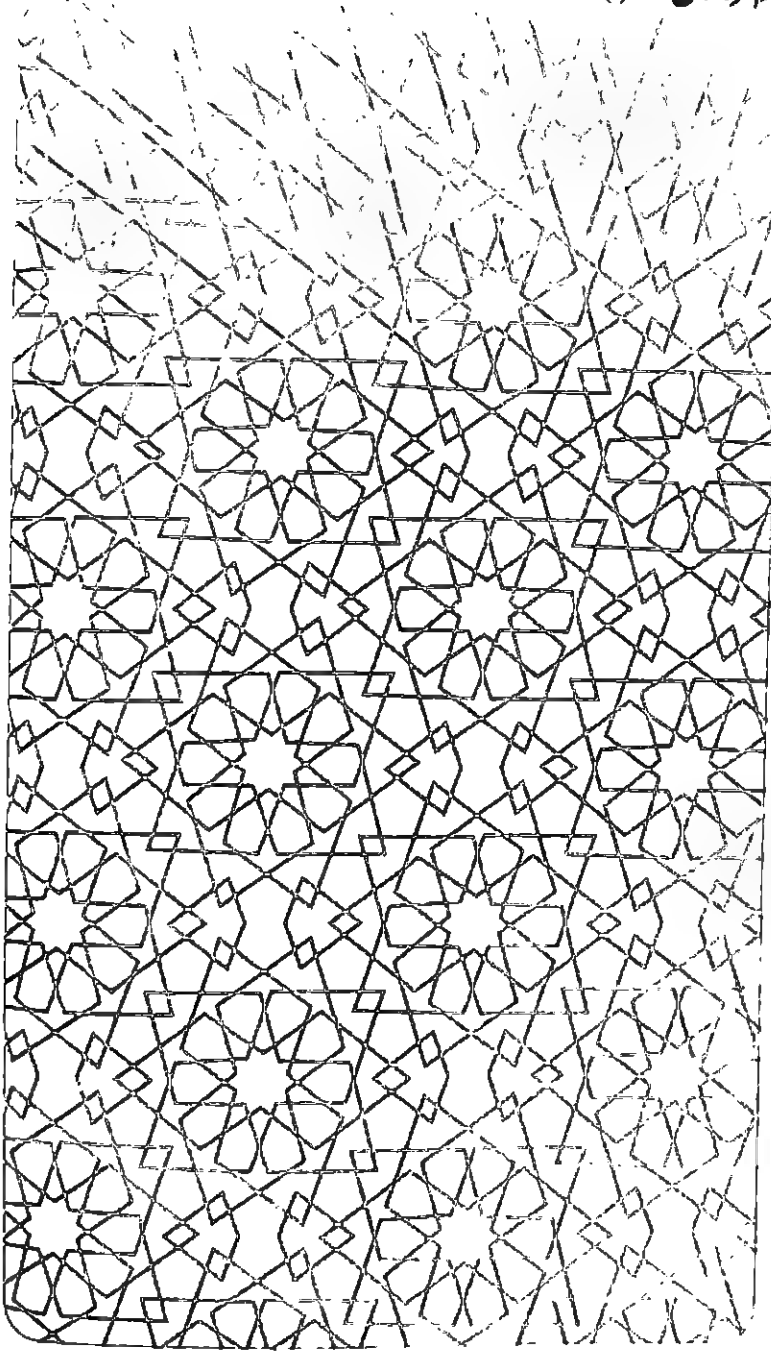
غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عن أبی هريرة رضی الله عنه أنّ النبی صلّى الله

علیہ وسلّم قال: "دَعُوْنِی مَاتَرَکْتُکُمْ إِنَّمَا اَھْلَكَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَثْرَۃُ سُؤَالِھِمْ وَاخْتِلَافُھُمْ عَلٰی اَنْبِیَاءِھِم، فَاِذَا نَھَیْتُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَاجْتَنِبُوْہُ، وَإِذَا اَمَرْتُکُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ". (۱)

کثرتِ سوال کا نتیجہ

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جب تک کسی خاص مسئلے کے بارے میں کوئی خاص بات نہ بتاؤں، اس وقت تک تم مجھے چھوڑے رکھو اور مجھ سے سوال نہ کرو، یعنی جس کام کے بارے میں، میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ کرنا فرض ہے یا یہ کام کرنا حرام اور ناجائز ہے، اس کام کے بارے میں بلا وجہ اور بلا ضرورت سوال کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ تم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی جو اُمتیں ہلاک ہوئیں، ان کی ہلاکت کا ایک سبب ان کا کثرت سے سوال کرنا بھی تھا اور دوسرا سبب اپنے انبیاء کے بتائے ہوئے احکام کی خلاف ورزی تھی، لہٰذا جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں تو تم اس سے رک جاؤ۔ اس میں قیل و قال اور چون و چرا نہ کرو اور

(۱) صحیح البخاری ۹/۹۴ (۷۲۸۸) طبع دار طوق النجاۃ۔ وصحیح مسلم ۲/۹۷۵ (۱۳۳۷) طبع دار احیاء التراث العربی۔ مذکورہ الفاظ امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب "ریاض الصالحین" ص۶۱ (۱۵۶) طبع دار الریان کے ہیں۔ مرتب۔

جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تو اس کو اپنی استطاعت کے مطابق بجا لاؤ۔"

حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ کی ہم پر شفقت دیکھیے کہ استطاعت کی قید لگا دی کہ اپنی استطاعت کے مطابق بجا لاؤ، گویا استطاعت سے زیادہ کا ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

کس قسم کے سوالات سے پرہیز کیا جائے

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے سوال کی کثرت کی مذمت بیان فرمائی ہے، لیکن بعض دوسری احادیث میں سوال کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إنما شفاء العي السوال"(۱)

یعنی پیاسے کی تشفی سوال سے ہوتی ہے۔

دونوں قسم کی احادیث اپنی اپنی جگہ درست ہیں، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ جس معاملے میں خود انسان کو حکم شرعی معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئے کہ یہ معاملہ جو میں کر رہا ہوں، شرعاً جائز ہے یا نہیں، ایسے موقع پر سوال نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضروری ہے، لیکن اگر سوالات کرنے کا منشا یا تو محض وقت گزاری ہے یا اس سوال کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مسئلہ اس کو پیش نہیں آیا یا وہ ایسا مسئلہ ہے جس کی دین میں کوئی اہمیت نہیں اور عملی

(۱) سنن ابی داود ۹۳/۱ (۳۳۶) طبع المکتبة العصرية۔ والحديث سكت عنه ابو داود والمنذری فی "مختصره" ۱۱۴/۱ (۳۳۶) طبع مكتبة المعارف الرياض. وذكره ابن الملقن فی "البدر المنير" ۲۱۵/۲ وقال: هذا إسناد كل رجاله ثقات. ط دار الهجرة.

زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ قبر میں اس کے بارے میں سوال ہوگا اور نہ آخرت میں سوال ہوگا اور اس کے معلوم نہ ہونے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، تو ایسے مسائل کے بارے میں سوال کرنے کی اس حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

فضول سوالات میں لگانا شیطان کا کام ہے

مثلاً ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جو دو بیٹے تھے، ''ہابیل'' اور ''قابیل''، ان دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا، اس لڑائی کا سبب ایک لڑکی تھی، اس لڑکی کا نام کیا تھا؟ اب بتایئے کہ اگر اس لڑکی کا نام معلوم ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور اگر معلوم نہ ہو تو اس سے نقصان کیا ہوگا؟ کیا قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے کہ اس لڑکی کا نام بتاؤ ورنہ تمہیں جنت نہیں ملے گی یا میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ اس کے نام کے بارے میں تم سے سوال کریں گے۔ لہٰذا اس قسم کے مسائل جن کا قبر میں، حشر میں، آخرت میں بھی واسطہ پیش نہیں آئے گا، ان کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو صحیح راستے سے ہٹانے کے لیے شیطان کے پاس مختلف حربے ہیں۔ ان میں سے ایک حربہ یہ ہے کہ وہ شیطان انسان کو ایسے کام میں لگا دیتا ہے جس کا کوئی حاصل نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عملی کاموں سے انسان غافل ہو جاتا ہے اور ان فضول سوالات کے چکر میں لگ جاتا ہے۔

حکمِ شرعی کی علت کے بارے میں سوال

اسی طرح آج کل لوگوں میں یہ مرض بہت عام ہے کہ جب کسی عمل کے

بارے میں بتاؤ کہ شریعت میں یہ حکم موجود ہے کہ یہ کام کرو، یا یہ حکم ہے کہ فلاں کام مت کرو، تو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ فلاں چیز کو جو حرام قرار دیا گیا ہے، یہ حرمت کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اور سوال کرنے والے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ اگر ہمارے اس سوال کا معقول جواب ہمیں مل گیا اور ہماری عقل نے اس جواب کو صحیح تسلیم کرلیا تب تو ہم اس حکمِ شرعی کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے، حالانکہ اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمایا کہ جب میں نے تم کو کسی چیز سے روک دیا تو تمہارا کام یہ ہے کہ رُک جاؤ اور اس تحقیق میں پڑنا تمہارا کام نہیں کہ اس روکنے میں کیا حکمت ہے؟ کیا مصلحت اور کیا فائدہ ہے؟

علّت کے بارے میں سوال کا بہترین جواب

ایک صاحب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے پاس آئے اور کسی شرعی مسئلے کے بارے میں پوچھنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو کیوں حرام کردیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک بات کا آپ جواب دے دیں تو میں اس کا جواب آپ کو دے دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کیا بات ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ کی ناک سامنے کیوں لگی ہے، پیچھے کیوں نہیں لگی؟ مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت سے اس کارخانۂ عالم کا نظام چلارہا ہے، تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا یہ چھوٹا سا دماغ جو تمہارے سر میں ہے، اس کی ساری حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کرلے، حالانکہ آج کے دور میں سائنس اتنی ترقی کے باوجود

اس چھوٹے سے دماغ پر بھی پوری تحقیق نہیں کرسکی اور یہ کہتی ہے کہ اس دماغ کا اکثر حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں اب تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ ایسے دماغ کے ذریعے تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ساری حکمتوں کا احاطہ کرلو کہ فلاں چیز کو کیوں حرام کیا؟ اور فلاں چیز کو کیوں حلال کیا؟ بات یہ ہے کہ اپنی حقیقت سے ناواقفیت اور دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کی کمی کے نتیجے میں اس قسم کے سوال ذہن میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں دخل مت دو

اب مثلاً کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے فجر کی نماز میں دو رکعت فرض فرمائی ہیں، ظہر کی نماز میں چار، عصر کی نماز میں چار، مغرب کی نماز میں تین رکعت فرض فرمائی ہیں، اس فرق کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اور کیا وجہ ہے؟ اب اگر کوئی شخص اپنے سے سوچ کر یہ کہے کہ فجر کی نماز کا وقت چونکہ فرصت کا ہوتا ہے تو اس وقت چار رکعت فرض ہونی چاہئیں اور چونکہ عصر کا وقت مشغولیت کا ہوتا ہے تو اس وقت دو رکعت فرض ہونی چاہئیں۔ ارے! تم اپنی چھوٹی سی عقل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کے اندر دخل دینا چاہتے ہو؟ اور یہ فیصلہ کرتے ہو کہ فلاں وقت اتنی رکعت فرض ہونی چاہیے۔ لہٰذا شریعت کے کسی بھی حکم کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ یہ حکم کیوں دیا گیا، یہ غلط سوال ہے، ایسے سوال سے آپ نے منع فرمایا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ''کیوں'' سے سوال نہیں کیا کرتے تھے

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات پڑھ کر دیکھیے تو آپ کو پورے

ذخیرۂ حدیث میں یہ کہیں نظر نہیں آئے گا کہ کسی صحابی نے کسی حکمِ شرعی کے بارے میں یہ سوال کیا ہو کہ یہ حکم کیوں دیا گیا؟ ایک مثال نہیں ملے گی۔ البتہ یہ سوال ملے گا کہ فلاں چیز کے بارے میں حکمِ شرعی کیا ہے؟ لفظ ''کیوں'' سے سوال نہیں کرتے تھے۔ سوال نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟ کیا ان کے اندر عقل اور سمجھ نہیں تھی؟ کیا وہ ان شرعی حکموں کی حکمتیں اور مصلحتیں نہیں پہچان سکتے تھے؟ ایسا نہیں تھا، کیونکہ ان کی عقل اتنی تھی کہ آج کے دور کا بڑے سے بڑا عقل مند ان کی عقل کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، پھر سوال نہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ وجہ یہ تھی کہ اس عقل ہی کا تقاضا یہ تھا کہ جب اللہ کو اپنا خالق اور مالک مان لیا اور نبی کریم سرورِ دوعالم ﷺ کو ان کا رسول مان لیا تو اب جو بات اور جو حکم بھی ان کی طرف سے آئے گا وہ حق ہوگا۔ اس میں ہمارے لیے چون و چرا کی مجال اور گنجائش نہیں۔ اس لیے لفظ ''کیوں'' سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سوال نہیں کرتے تھے۔

یہ اللہ کی محبت اور عظمت کی کمی کی دلیل ہے

میرے والدِ ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ شریعت کے احکام کے سلسلے میں جن لوگوں کے دلوں میں بہت زیادہ شکوک و شبہات ہوتے ہیں، اس کی اصل وجہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کی کمی ہے۔ اس لیے کہ جس ذات کی عظمت اور محبت دل میں ہوگی، اس کی طرف سے دیے گئے حکم میں شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوں گے، دنیا کے اندر دیکھ لیں کہ جس سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے، وہ اگر کسی بات کا حکم دے تو چاہے وہ حکم ہماری سمجھ میں نہ آ رہا ہو، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اتنا بڑا آدمی ہے کہ اس کے حکم کے پیچھے کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی! تو وہ ذات جس کی قدرت، جس کا علم اور

جس کی رحمت ساری کائنات کو محیط ہے، وہ ذات اگر یہ حکم دے کہ یہ عمل کرو اور یہ عمل مت کرو تو اس کی عظمت اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ مجھے یہ حکم کیوں دیا جارہا ہے؟ اور اس حکم میں کیا فائدہ اور کیا مصلحت ہے؟ دین نام ہی اس کا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے حوالے کردو اور چون و چرا کو درمیان سے نکال دو۔ آج کی گمراہیوں کا سب سے بڑا سرچشمہ اور بنیادی سبب یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام کو اپنی عقل سے پرکھنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اگر کسی حکم کی حکمت عقل میں نہیں آرہی تو اس کو شریعت کا حکم ماننے سے انکار کیا جارہا ہے۔

بچے اور نوکر کی مثال

چھوٹا بچہ جو ابھی بالکل نادان ہے، باپ اس کو کسی کام کا حکم دیتا ہے یا ماں اس کو حکم دیتی ہے۔ اگر وہ بچہ یہ کہے کہ مجھے یہ حکم کیوں دیا جارہا ہے؟ جب تک آپ مجھے اس کام کی حکمت نہیں سمجھائیں گے، اس وقت تک میں یہ کام نہیں کروں گا۔ تو ایسا بچہ کبھی صحیح تربیت نہیں پاسکے گا۔ بچے کو چھوڑیے، ایک آدمی جو عاقل و بالغ ہے اور اس کو آپ نے اپنا نوکر رکھا ہوا ہے، آپ نے اس سے کہا کہ بازار جاکر فلاں سودا لے آؤ، وہ نوکر پلٹ کر یہ پوچھتا ہے کہ پہلے آپ مجھے

اس کی حکمت اور وجہ بتائیے کہ آپ یہ چیز بازار سے کیوں منگوار ہے ہیں؟ پہلے آپ حکمت بتائیے پھر میں بازار سے یہ چیز لاؤں گا۔ ایسا نوکر کان سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینے کے لائق ہے۔ اس لیے کہ نوکر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ پوچھے کہ آپ یہ چیز کیوں منگوار ہے ہیں؟ وہ نوکر ہے اور نوکر کا کام یہ ہے کہ جو حکم بھی اس کو دیا جارہا ہے وہ اس کو بجالائے۔ وہ یہ نہ پوچھے کہ یہ حکم کیوں دیا

جارہا ہے؟ جب نوکروں کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ ہے، حالانکہ نوکر بھی انسان ہے اور تم بھی انسان ہو، تو اللہ تو خالق اور معبود ہیں اور تم اس کے بندے ہو، نوکر اور آقا میں تو پھر بھی مناسبت ہے، اس لیے کہ دونوں کی عقل محدود ہے، لیکن بندے اور اللہ میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں، اس لیے کہ تمہاری عقل محدود اور اللہ جل شانہٗ کی حکمتیں لامحدود، اس لیے اللہ کے حکم کی حکمت کے بارے میں سوال کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

خلاصہ

بہرحال! اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تین قسم کے سوالات سے منع فرمایا ہے، ایک بے فائدہ سوال کرنا، جس کا عملی زندگی سے تعلق نہ ہو۔ دوسرے ایسے معاملے یا ایسی صورتِ حال کے بارے میں سوال کرنا جو اپنی ذات کو ابھی پیش نہ آیا ہو۔ تیسرے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے کسی حکم کی حکمت معلوم کرنے کے لیے سوال کرنا اور مقصد سوال کرنے کا یہ ہو کہ اگر اس حکم کی حکمت معلوم ہوگی تو عمل کروں گا ورنہ نہیں کروں گا۔ اور فرمایا کہ پچھلی اُمتیں ان تین چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ تم ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے پرہیز کرو اور جب میں تم کو کسی چیز سے روک دوں تو تم رک جاؤ، اس کی حکمت تلاش کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین
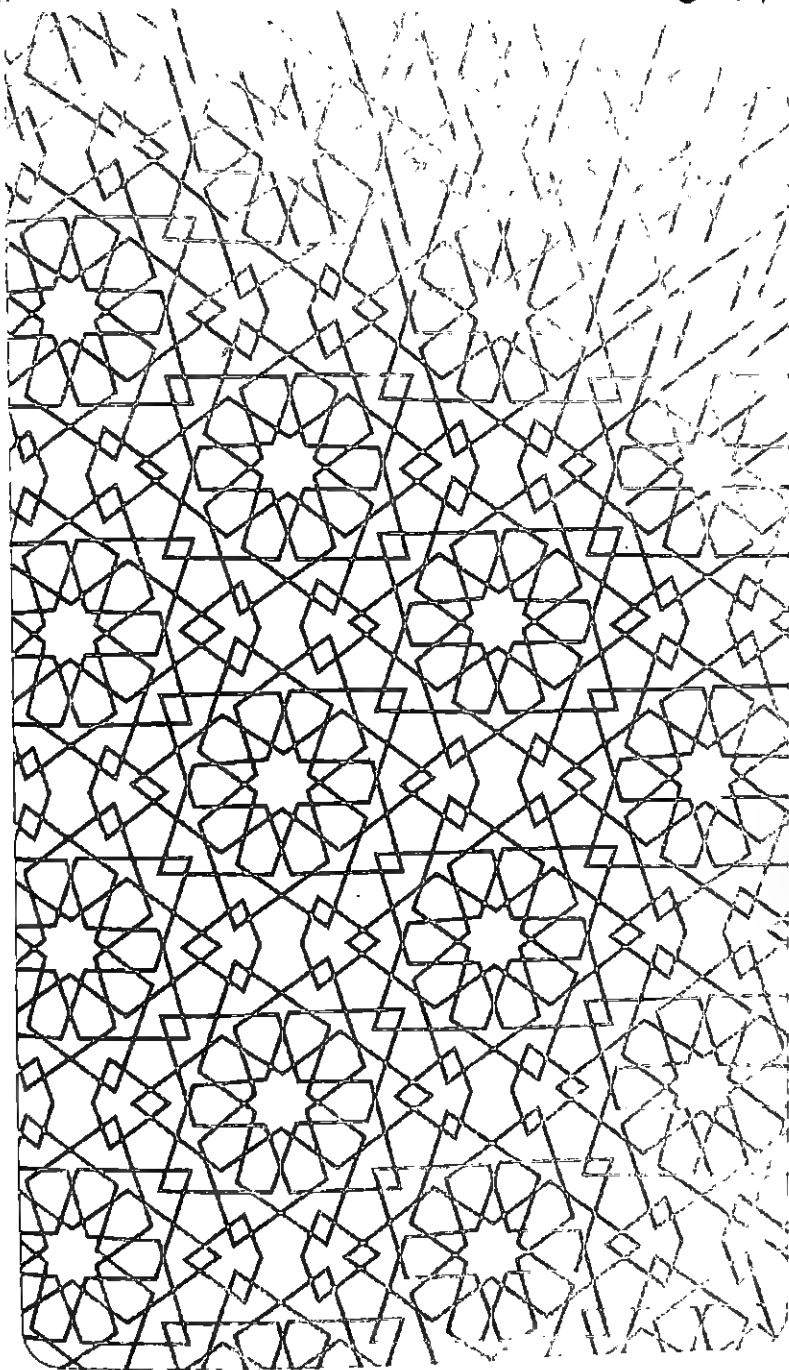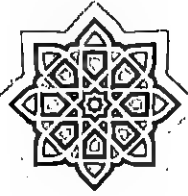
بحث و مباحثہ
اور
جھوٹ ترک کیجیے

(اصلاحی خطبات ج ۱۰ ص ۱۱۹)
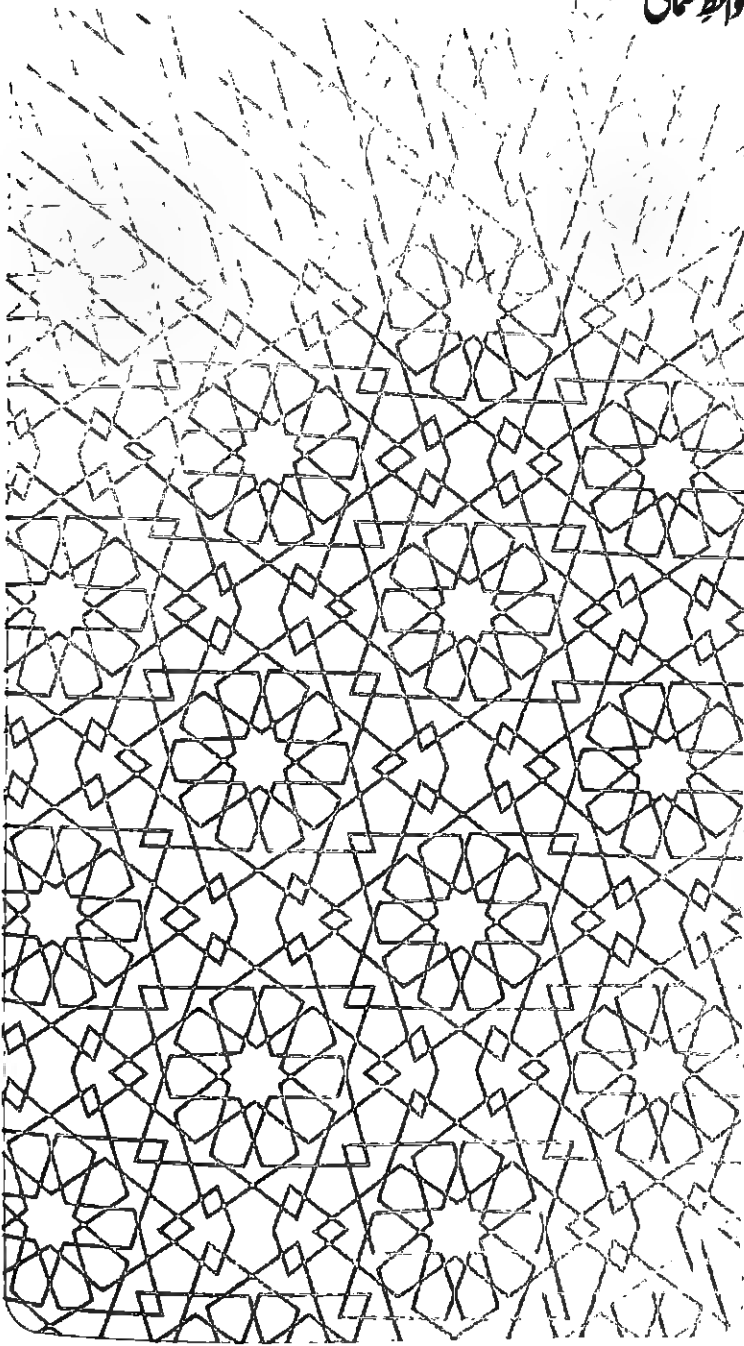
بسم اللہ الرحمن الرحیم

بحث ومباحثہ اور جھوٹ ترک کیجیے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى تعالىٰ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا،

أما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عن ابى هريرة رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلّم: ”لَايُؤْمِنُ الْعَبْدُ الْاِيْمَانَ كُلَّهٗ حَتّٰى يَتْرُكَ الْكَذِبَ فِى الْمُزَاحَةِ

وَيَتْرُكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ صَادِقًا"(۱)

ایمانِ کامل کی دو علامتیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا نہ چھوڑے اور بحث و مباحثہ نہ چھوڑے، چاہے وہ حق پر ہو۔

اس حدیث میں دو چیزیں بیان فرمائیں کہ جب تک آدمی ان دونوں چیزوں کو نہیں چھوڑے گا اس وقت تک آدمی صحیح طور پر مؤمن نہیں ہوسکتا، ایک یہ کہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے اور دوسرے یہ کہ سچا ہونے کے باوجود بحث و مباحثہ میں نہ پڑے۔

مذاق میں جھوٹ بولنا

پہلی چیز جس کا اس حدیث میں حکم دیا گیا ہے وہ ہے جھوٹ چھوڑنا اور اس میں بھی خاص طور پر مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کا ذکر فرمایا، اس لیے کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ اسی وقت ناجائز اور حرام ہے جب وہ سنجیدگی سے بولا جائے اور مذاق میں جھوٹ بولنا جائز ہے، چنانچہ اگر کسی سے کہا جائے کہ تم نے فلاں موقع پر یہ بات کہی تھی، وہ تو ایسی نہیں تھی، تو جواب میں وہ کہتا ہے کہ

(۱) مسند احمد ۷۲۷/۱٤ (۸٦۳۰) طبع الرسالة۔ والمعجم الاوسط ۲۰۸/۵ (۵۱۰۳) طبع دار الحرمین القاهره. وذكره المنذری فی "الترغيب والترهيب" ۳٦۷/۳ وقال: رواه أحمد والطبراني... ورواه أبو يعلى من حديث عمر بن الخطاب رضي الله عنه ولفظه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يبلغ العبد صريح الإيمان حتى يدع المزاح والكذب ويدع المراء وإن كان محقا. وفي أسانيدهم من لا يحضرني حاله، ولمتنه شواهد كثيرة. طبع دار الكتب العلمية.

میں تو مذاق میں یہ بات کہہ رہا تھا۔ گویا کہ مذاق میں جھوٹ بولنا کوئی بری بات ہی نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی زبان سے خلاف واقعہ بات نکلے ہی نہیں، حتیٰ کہ مذاق میں بھی نہ نکلے۔ اگر مذاق اور خوش طبعی حد کے اندر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، شریعت نے خوش طبعی اور مذاق کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ اس کی تھوڑی سی ترغیب بھی دی ہے، ہر وقت آدمی خشک اور سنجیدہ ہو کر بیٹھا رہے کہ اس کے منہ پر کبھی تبسم اور مسکراہٹ ہی نہ آئے یہ بات پسندیدہ نہیں۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق کرنا ثابت ہے، لیکن ایسا لطیف مذاق اور ایسی خوش طبعی کی باتیں آپ سے منقول ہیں جو لطیف بھی ہیں اور ان میں کوئی بات خلاف واقعہ بھی نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق کا ایک واقعہ

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے ایک اونٹ دے دیجیے۔ اس زمانے میں اونٹ سب سے بڑی دولت ہوتی تھی اور مال داری کی علامت سمجھی جاتی تھی، جس کے پاس جتنے زیادہ اونٹ ہوتے تھے وہ اتنا ہی بڑا مال دار ہوتا تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا، ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا مجھے تو اونٹ چاہیے جو مجھے سواری کے کام آسکے۔ آپ نے فرمایا کہ ارے! جو بھی اونٹ ہوگا وہ بھی تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوگا۔(۱)

(۱) سنن ابی داود ٤/٣٠٠ (٤٩٩٨) وسنن الترمذی ٣/٥٢٩ (١٩٩١) وقال هذا حديث صحيح غريب.

دیکھیے، آپ نے مزاح فرمایا اور خوش طبعی کی بات فرمائی لیکن حق بات کہی، کوئی جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات نہیں کہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذاق کا دوسرا واقعہ

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک خاتون حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمادیں، آپ نے فرمایا کہ کوئی بوڑھی جنت میں نہیں جائے گی، جب آپ نے دیکھا کہ وہ پریشان ہورہی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی خاتون بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، بلکہ جوان ہوکر جائے گی۔ (۱)

دیکھیے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذاق فرمایا اور خوش طبعی کی بات کی، لیکن اس میں کوئی جھوٹ اور غلط بیانی کا پہلو نہیں تھا۔ یہ مذاق کرنا بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، لہٰذا جب کوئی شخص اتباعِ سنت کی نیت سے مذاق کرے گا تو ان شاء اللہ اس پر ثواب کی بھی امید ہے۔ ہمارے جتنے بزرگ گزرے ہیں ان سب کا حال یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی خشک نہیں تھا، ایسا خشک کہ بت بنے بیٹھے ہیں اور زبان پر خوش طبعی کی بات ہی نہیں آتی، بلکہ یہ حضرات اپنے ساتھیوں سے خوش طبعی کی اور دل لگی کی باتیں بھی کیا کرتے تھے اور بعض بزرگ تو اس بارے میں مشہور تھے، لیکن اس خوش طبعی اور مذاق میں جھوٹ نہیں ہوتا تھا اور جب

(۱) الشمائل المحمدیہ للترمذی ص ۱۴۳ (۲۳۰) طبع دار احیاء التراث العربی.

اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرماتے ہیں تو اس کی زبان اس طرح کر دیتے ہیں کہ اس زبان پر کبھی جھوٹ کی کوئی بات آتی ہی نہیں، نہ مذاق میں نہ ہی سنجیدگی میں۔

حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ اور دل لگی

تھانہ بھون کے اقطابِ ثلاثہ مشہور ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کے بارے میں بعض بزرگوں کا یہ مکاشفہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد ہوا تھا، وہ اسی دولہا کی بارات سجانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا تھا، لیکن ان کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی ان کی مجلس میں جا کر بیٹھتا تو دیکھتا کہ وہاں تو ہنسی مذاق اور دل لگی ہو رہی ہے۔ جب کوئی شخص ان کے پاس جاتا تو فرماتے کہ بھائی اگر فتویٰ لینا ہے تو دیکھو سامنے مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب بیٹھے ہیں ان کے پاس چلے جاؤ۔ اگر ذکر و اذکار سیکھنا ہو اور بیعت ہونا ہو تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (رحمۃ اللہ علیہ) تشریف فرما ہیں، ان سے جا کر تعلق قائم کرلو، اور حقہ پینا ہو تو یاروں کے پاس آجاؤ۔ اس طرح کی دل لگی کی باتیں کیا کرتے تھے، لیکن اس دل لگی کے پردے میں اپنے باطن کے مقامِ بلند کو چھپایا ہوا تھا۔

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور قہقہے

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، ان کے حالات میں ان کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ

"كُنَّا نَسْمَعُ ضِحْكَهُ فِي النَّهَارِ وَبُكَاءَهُ بِاللَّيْلِ." (۱)

یعنی دن کے وقت ہم ان کے ہنسنے کی آوازیں سنا کرتے تھے اور ان کی مجلس میں قہقہے گونجتے تھے اور رات کے وقت ان کے رونے کی آوازیں آیا کرتی تھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور جب سجدہ ریز ہوتے تو روتے رہتے تھے۔

حدیث میں خوش طبعی کی ترغیب

بہرحال! یہ مذاق اپنی ذات میں برا نہیں بشرطیکہ حدود کے اندر ہو اور آدمی ہر وقت ہی مذاق نہ کرتا رہے، بلکہ کبھی کبھی مذاق اور دل لگی کرنی چاہیے۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

"رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً بِسَاعَةٍ" (۲)

یعنی اپنے دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام دیا کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ کاموں میں لگا ہوا ہے تو تھوڑا وقت وہ ایسا بھی نکالے جس میں آزادی سے خوش طبعی کی باتیں بھی کرلے، گویا کہ وہ بھی مطلوب ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، لیکن اس کا خیال رہے کہ کسی بھی وقت منہ سے غلط بات نہ نکلے۔ بہرحال! جب مذاق میں جھوٹ بولنے کو منع کیا گیا ہے تو سنجیدگی میں جھوٹ بولنا کتنی بری بات ہوگی، اور مؤمن کی بنیادی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ اس کے منہ سے غلط بات نہیں نکلتی

---

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر ۲۰۹/۵۳ طبع دار الفکر۔

(۲) المراسیل لابی داود کمافی "تحفة الاشراف" ۳۷۱/۱۳ (۱۹۳۵۳) طبع المکتب الاسلامی. ومسند الشہاب القضاعی ۳۹۳/۱ (۶۷۲) طبع الرسالة۔

حتیٰ کہ جان پر مصیبت آجاتی ہے اس وقت بھی مؤمن جھوٹ سے بچتا ہے، حالانکہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ جان بچانے کی خاطر اگر کوئی شخص جھوٹ بولے تو اس کی اجازت ہے، لیکن جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں اس وقت بھی ان کے منہ پر صریح جھوٹ جاری نہیں ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کے سفر میں حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ جارہے تھے، مکہ مکرمہ کے کافروں نے آپ ﷺ کو پکڑنے کے لیے ہرکارے دوڑائے ہوئے تھے اور یہ اعلان کیا ہوا تھا کہ جو شخص آپ (ﷺ) کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ کتنا بڑا انعام تھا، آج بھی سو اونٹ کی قیمت لاکھوں تک پہنچ جائے گی اور سارا مکہ اس فکر میں تھا کہ آپ (ﷺ) کو کہیں سے پکڑ لائیں، اس حالت میں ایک شخص آپ تک پہنچ گیا، وہ شخص حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا، لیکن آپ (ﷺ) سے واقف نہیں تھا۔ اس نے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ اب اگر صحیح بتاتے ہیں تو جان کا خطرہ ہے اور اگر نہیں بتاتے ہیں تو غلط بیانی اور جھوٹ ہوتا ہے، جو لوگ سچ بولنے کا اہتمام کرتے ہیں، ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتے ہیں۔ آپ تو ''صدیق'' (رضی اللہ عنہ) تھے، چنانچہ اس شخص کے سوال کے جواب میں آپ کے منہ سے یہ نکلا کہ ''هَادٍ يَهْدِينِي السَّبِيلَ'' یہ رہنما ہیں اور مجھے راستہ دکھلاتے ہیں۔ اب دیکھیے آپ نے ایک ایسا جملہ بول دیا جس میں جھوٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا، اس لیے کہ آپ ﷺ واقعی رہنما تھے اور

دین کا راستہ دکھلاتے تھے اور جان بھی بچ گئی۔(۱)

دیکھیے! جان پر بنی ہوئی ہے، مگر اس وقت بھی زبان پر صریح جھوٹ نہیں آرہا ہے، حالانکہ ایسے موقع پر جبکہ جان کا خطرہ ہو، شریعت نے جھوٹ بولنے کی گنجائش دے دی ہے، لیکن صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے زبان سے جھوٹ کا کلمہ نہیں نکالا۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے، ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے موقع پر ان کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے، اس وقت یہ عالم تھا کہ چوراہوں پر پھانسیوں کے تختے لٹکے ہوئے تھے اور جب کسی کے بارے میں پتا چلتا کہ یہ جہاد میں شریک ہے، اس کو فوراً پکڑ کر چوراہے پر پھانسی دے دی جاتی تھی۔ اس حالت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں چھتے کی مسجد میں تشریف فرما تھے، آپ بالکل سادہ رہتے تھے اور عام طور پر آپ تہبند اور معمولی کرتا پہنے رہتے تھے، دیکھنے میں پتا نہیں چلتا تھا کہ آپ اتنے بڑے علامہ ہوں گے۔ ایک دن آپ کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس مسجد کے اندر پہنچ گئی، اندر جا کر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ پولیس والوں کے ذہن میں یہ تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب بہت بڑے علامہ ہوں گے اور آپ جبہ اور پگڑی پہنے ہوئے شان و شوکت کے ساتھ بیٹھے ہوں گے، لیکن اندر مسجد میں دیکھا کہ ایک آدمی لنگی اور معمولی کرتا پہنے ہوئے

(۱) صحیح البخاری ۶۲/۵ (۳۹۱۱) و مسند احمد ۴۳۶/۲۰ (۱۳۲۰۵).

ہے، پولیس والے یہ سمجھے کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے، ان سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کہاں ہیں؟ اب اگر یہ جواب دیتے ہیں کہ میں ہوں تو پکڑے جاتے ہیں اور اگر کوئی اور بات کہتے ہیں تو جھوٹ ہوجاتا ہے۔ آپ نے یہ کیا کہ جس جگہ پر کھڑے تھے اس جگہ سے ذرا سے پیچھے ہٹ گئے اور پھر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہیں تھے، یہ جواب دیا۔ آپ دیکھیں کہ ایسے وقت میں جبکہ پھانسی دیے جانے کا خطرہ آنکھوں کے سامنے ہے اور موت آنکھوں کے سامنے رقص کررہی ہے، اس وقت بھی صریح جھوٹ زبان سے نہیں نکالا، اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا اور اس پولیس کے دل میں یہ بات آگئی کہ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں ہوں گے اور اب کہیں نکل گئے۔ بہرحال، جھوٹ ایسی چیز ہے کہ ایک مؤمن تختہ دار پر بھی اس کو گوارا نہیں کرتا۔

آج معاشرے میں پھیلے ہوئے جھوٹ

اس لیے حتی الامکان جہاں تک ہوسکے انسان جھوٹ نہ بولے۔ جب شریعت نے سچ بولنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے اور جھوٹ بولنے کی ممانعت فرمائی ہے، حتیٰ کہ مذاق میں اور حالت جنگ میں بھی جھوٹ کی ممانعت فرمائی ہے تو عام حالات میں جھوٹ کی اجازت کیسے ہوگی؟ آج کل ہمارا معاشرہ جھوٹ سے بھر گیا ہے، اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے والے صحبت یافتہ لوگ بھی صریح جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں، مثلاً چھٹی لینے کے لیے جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوارہے ہیں اور دل میں ذرا سا یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ ہم نے جھوٹ کا ارتکاب کیا ہے۔ تجارت میں، صنعت میں، کاروبار میں جھوٹے سرٹیفکیٹ، جھوٹے بیانات، جھوٹی گواہیاں ہورہی ہیں۔ یہاں تک

نوبت آ گئی ہے کہ اب کہنے والے یہ کہتے ہیں ''اس دنیا میں سچ کے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا۔'' ۔العیاذ باللہ العلی العظیم۔ یعنی سچ بولنے والا زندہ نہیں رہ سکتا اور جب تک جھوٹ نہیں بولے گا اس وقت تک کام نہیں چلے گا۔ حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ

"تحروا الصدق وإن رأيتم أن فيه الهلكة فإن فيه النجاة، واجتنبوا الكذب وإن رأيتم أن فيه النجاة فإن فيه الهلكة"

سچ بولنے کی فکر کرو اگرچہ تمہیں سچ بولنے میں ہلاکت نظر آتی ہو، کیوں کہ سچ بولنے میں نجات ہے اور جھوٹ سے بچو اگرچہ تمہیں اس میں نجات نظر آ رہی ہو، کیونکہ جھوٹ میں ہلاکت ہے۔ (1)

بظاہر وقتی طور پر جھوٹ بولنے سے کوئی نفع حاصل ہوجائے، لیکن انجام کار جھوٹ میں فلاح اور کامیابی نہیں، سچائی میں فلاح ہے، اللہ کا حکم ماننے میں فلاح ہے۔

اس لیے سچائی کا اہتمام کرنا چاہیے اور پھر اس بارے میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہر ایک جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے، لیکن ہمارے معاشرے

---

(۱) الزهد لهناد بن السری ۶۳۵/۲ طبع دار الخلفاء الكويت، ومكارم الاخلاق لابن ابی الدنيا ص ۵۱ (۳۷) طبع مكتبة القرآن القاهرة، وكتاب الصمت لابن ابی الدنيا ۲۲۷ (٤٤٦) طبع دار الكتاب العربی۔ وذكره المنذری فی "الترغيب" ۳۶۵/۳ وقال رواه ابن ابی الدنيا فی كتاب الصمت هكذا معضلا ورواته ثقات۔ طبع دار الكتب العلميه۔

میں آج کل جھوٹ کی ہزاروں قسمیں نکل آئی ہیں، یہ جھوٹے سرٹیفکیٹ، جھوٹے بیانات وغیرہ، یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے، اس میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بہرحال، اس حدیث میں ایک بات تو یہ بیان فرمائی کہ بندے کے مکمل مؤمن ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

بحث ومباحثہ سے پرہیز کریں

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ حق پر ہونے کے باوجود بحث ومباحثہ سے پرہیز کرے، ہماری زبان کی آفتوں میں سے ایک بڑی آفت "بحث ومباحثہ" بھی ہے لوگوں کو اس کا بڑا ذوق ہے، جہاں چند افراد کی مجلس جمی اور کوئی موضوع نکلا، بس پھر اس موضوع پر بحث ومباحثہ شروع ہوگیا۔ وہ مباحثہ بھی ایسی فضول باتوں کا جن کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہے اور نہ آخرت میں کوئی فائدہ۔ یاد رکھیے! یہ بحث ومباحثہ ایسی چیز ہے جو انسان کے باطن کو تباہ کردیتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"المراء یذھب بنور العلم"(۱)

"بحث ومباحثہ علم کے نور کو تباہ کردیتا ہے۔"

اور بحث ومباحثہ کی عادت عالموں میں زیادہ ہوتی ہے، اس لیے کہ ہر عالم یہ سمجھتا ہے کہ میں زیادہ جانتا ہوں، اگر دوسرے نے کوئی بات کہہ دی تو اس سے

(۱) فتح الباری لابن حجر ۲۶۳/۱۳ طبع دار المعرفة بیروت۔

بحث مباحثہ کرنے کو تیار اور اس مباحثے میں گھنٹوں خرچ ہو رہے ہیں، چاہے وہ مباحثہ زبانی ہو یا تحریری ہو۔ بس اسی میں وقت صرف ہو رہا ہے۔

اپنی رائے بیان کر کے علیحدہ ہوجائیں

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے دوسرے کی رائے سے مختلف ہے تو تم اپنی رائے بیان کردو کہ میری رائے یہ ہے اور دوسرے کی بات سن لو۔ اگر سمجھ میں آتی ہے تو قبول کرلو اور اگر سمجھ میں نہیں آتی تو بس یہ کہہ دو کہ تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی، تمہاری سمجھ میں جو آرہا ہے تم اس پر عمل کرلو اور میری سمجھ میں جو آرہا ہے میں اس پر عمل کروں گا۔ بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں اس لیے کہ بحث ومباحثہ میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں دوسرے پر غالب آجاؤں، میری بات اونچی رہے اور دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس کے نتیجے میں پھر حق و باطل میں امتیاز باقی نہیں رہتا، بلکہ یہ فکر سوار ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ہو بس دوسرے کو زیر کرنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ فرمادیا کہ اگر تم حق پر ہو اور صحیح بات کہہ رہے ہو اور دوسرا شخص غلط بات کہہ رہا ہے، پھر بھی بحث و مباحثہ مت کرو، بس اپنا موقف بیان کردو اور اس سے کہہ دو کہ تمہاری سمجھ میں آئے تو قبول کرلو اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو تم جانو، تمہارا کام جانے۔ تو اس حدیث میں حق بات پر بھی بحث و مباحثہ سے ممانعت فرمادی۔

سورۂ کافرون کے نزول کا مقصد

سورۂ "قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ" جس کو ہم اور آپ نماز میں پڑھتے ہیں، یہ

اسی مقصد کو بتانے کے لیے نازل ہوئی ہے۔[1] وہ اس طرح کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا توحید کا پیغام کفار مکہ کے سامنے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا، اس کے دلائل بیان فرمادیے، لیکن بیان کرنے کے بعد جب بحث و مباحثہ کی نوبت آگئی تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝[2]

”آپ فرمادیجیے اے کافرو! تم جس کی عبادت کرتے ہو، میں اس کی عبادت نہیں کرتا اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارا دین تمہارے ساتھ اور میرا دین میرے ساتھ۔“

مطلب یہ ہے کہ میں بحث و مباحثہ کرنا نہیں چاہتا، جو حق کے دلائل تھے وہ واضح کرکے بتادیے، سمجھادیے، اگر قبول کرنا ہو تو اپنی فلاح اور کامیابی کی خاطر قبول کرلو، آگے فضول بحث و مباحثہ میں وقت ضائع کرنا نہ تمہارے حق میں

---

(۱) تفسیر الطبری ٦٦١/٢٤ طبع دار التربية والتراث، وتفسير ابن كثير ٥٠٧/٨ طبع دار طيبه.

(۲) سورة الكافرون آيت (١تا٦).

مفید ہے اور نہ میرے حق میں مفید ہے، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

دوسرے کی بات قبول کرلو ورنہ چھوڑ دو

دیکھیے! خالص کفر اور اسلام کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ یہ کہہ دو کہ میں جھگڑا نہیں کرتا اور بحث و مباحثے میں نہیں پڑتا۔ جب کفر اور اسلام کے معاملے میں یہ حکم ہے تو اور دوسرے مسائل میں اس سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہر وقت ہمارے درمیان بحث و مباحثے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ باطن کو خراب کرنے والی چیز ہے۔ اگر کسی سے کسی مسئلے پر کوئی بات کرنی ہو تو طلبِ حق کے ساتھ بات کرو، اسے حق پہنچانے کے لیے بات کرو، اپنا مؤقف بیان کردو، دوسرے کا مؤقف سن لو، سمجھ میں آئے تو قبول کرلو، سمجھ میں نہ آئے تو چھوڑ دو، بس، لیکن بحث نہ کرو۔

ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہوجائے گا

میرے پاس بے شمار لوگ خطوط کے اندر لکھتے رہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے اس مسئلے میں بحث ہوئی، وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں، ہم ان کا کیا جواب دیں؟ اب بتایئے! اگر یہ سلسلہ آگے اسی طرح جاری رہے کہ وہ ایک دلیل پیش کریں اور آپ مجھ سے پوچھ لیں کہ اس کا کیا جواب دیں؟ میں اس کا جواب بتادوں، پھر وہ کوئی دوسری دلیل پیش کریں تو پھر تم مجھ سے پوچھوگے کہ اس دلیل کا کیا جواب دیں، تو اس طرح ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہوجائے گا۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ بحث و مباحثہ ہی مت کرو، بلکہ اپنا مسلک بیان کردو کہ میرے

نزدیک یہ حق ہے، میں اس پر کاربند ہوں۔ سامنے والا قبول کرلے تو ٹھیک، نہیں قبول کرتا تو اس سے یہ کہہ دو کہ تم جانو تمہارا کام جانے، میں جس راستے پر ہوں اسی راستہ پر قائم رہوں گا۔ اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہی ہے کہ اگر تم سچے اور حق پر ہو، پھر بھی بحث و مباحثے میں مت پڑو۔

مناظرہ مفید نہیں

آج کل "مناظرہ" کرنا اور اس مناظرے میں دوسرے کو شکست دینا ایک ہنر بن گیا ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب نئے نئے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تو اس وقت حضرت والا کو باطل فرقوں سے مناظرہ کرنے کا بہت شوق تھا، چنانچہ فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصے تک مناظروں کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور جب بھی کسی سے مناظرہ کرتے تو دوسرے کو زیر ہی کردیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قوتِ بیان خوب عطا فرمائی تھی، لیکن حضرت خود فرماتے ہیں کہ کچھ دن کے بعد اس مناظرے کے کام سے ایسا دل ہٹا کہ اب میں کسی طرح بھی کسی سے مناظرہ کرنے کو تیار نہیں۔ فرمایا کہ جب میں مناظرہ کرتا تھا تو دل میں ایک ظلمت محسوس ہوتی تھی، پھر بعد میں ساری عمر کبھی مناظرہ نہیں کیا، بلکہ دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ یہ کچھ فائدہ مند نہیں ہے، کہیں واقعی ضرورت پیش آجائے اور حق کی وضاحت مقصود ہو تو اور بات ہے، ورنہ اس کو اپنا مشغلہ بنانا اچھی بات نہیں۔ جب علماءِ کرام کے لیے یہ اچھی بات نہیں تو عام آدمی کے لیے دین کے مسائل پر بحث کرنا فضول بات ہے۔

فالتو عقل والے بحث و مباحثہ کرتے ہیں

اکبر الہ آبادی مرحوم جو اردو کے مشہور شاعر ہیں، انہوں نے اس بحث و مباحثہ کے بارے میں بڑا اچھا شعر کہا ہے، وہ یہ کہ ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یعنی مذہبی بحث وہ کرے جس میں فالتو عقل ہو۔ ہر آدمی کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ معلوم نہیں تو کسی جاننے والے سے پوچھ لو، کوئی بات سمجھ نہیں آرہی ہے تو پوچھ لو، طالبِ حق بن کر معلوم کرلو، لیکن بحث و مباحثے میں کچھ نہیں رکھا۔

بحث و مباحثہ سے ظلمت پیدا ہوتی ہے

اس حدیث کی تشریح میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحث و مباحثے سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ ایمان کا کامل نہ ہونا ظلمت ہے اور اسی لیے تم اہلِ طریقت کو دیکھو گے کہ وہ بحث و مباحثے سے سخت نفرت کرتے ہیں۔"

یعنی تصوف اور سلوک کے راستے پر چلنے والے، اولیاء اللہ بحث و مباحثے سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

جناب مودودی صاحب سے مباحثہ کا ایک واقعہ

ہمارے ایک بزرگ تھے حضرت بابا نجم الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور بڑے عجیب بزرگ تھے، ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ

> ''جناب مودودی صاحب نے اپنی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' میں بعض صحابہ کرام پر بڑے غلط انداز میں گفتگو کی ہے، تم اس کے اوپر کچھ لکھو۔''

چنانچہ میں نے اس پر مضمون لکھ دیا، اس مضمون پر پھر مودودی صاحب کی طرف سے جواب آیا، اس پر پھر میں نے ایک مضمون بطور جواب کے لکھ دیا۔ اس طرح دو مرتبہ جواب لکھا۔ جب حضرت بابا نجم الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرا دوسرا جواب پڑھا تو مجھے ایک پرچہ لکھا، وہ پرچہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، اس میں یہ لکھا تھا:

> ''میں نے تمہارا یہ مضمون پڑھا اور پڑھ کر بڑا دل خوش ہوا اور دعائیں نکلیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔''

پھر لکھا کہ

> ''اب اس مردہ بحثا بحثی کو دفنا دیجیے۔''

یعنی اب یہ آخری مرتبہ لکھ دیا اور جو حق واضح کرنا تھا وہ کر دیا، اب اس کے بعد اگر وہاں سے کوئی جواب بھی آئے تب بھی تم اس کے جواب میں کچھ مت لکھنا، اس لیے کہ پھر تو بحث و مباحثے کا دروازہ کھل جائے گا۔ بہرحال! یہ

اولیاء اللہ اس بحث ومباحثے سے سخت نفرت کرتے ہیں، کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، آج تک آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی مناظرے کے نتیجے میں حق قبول کرنے کی توفیق ہوئی ہو، سوائے وقت ضائع کرنے کے کچھ حاصل نہیں۔

یہ اہل اللہ بحث ومباحثے سے نفرت کیوں نہ کریں جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ ''مؤمن کی علامت یہ ہے کہ وہ بحث ومباحثہ میں نہیں پڑتا۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بحث ومباحثے اور جھوٹ سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

سچی طلب پیدا کریں

(اصلاحی خطبات ج ۱۲ ص ۲۵۸)
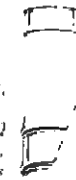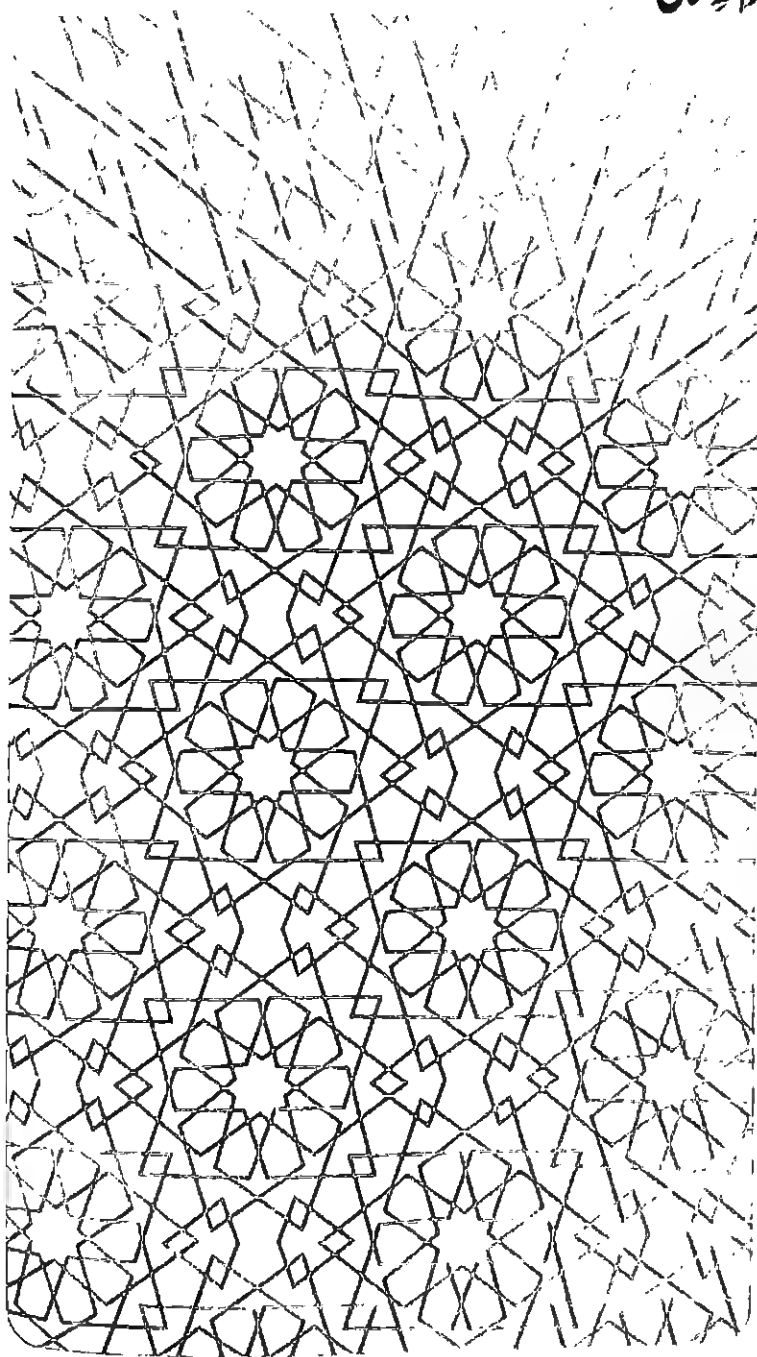
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سچی طلب پیدا کریں
اور
فضول سوال و بحث و مباحثے سے بچیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا،

اما بعد!

عن وراد قال کَتَبَ مُغِیْرَۃُ إِلیٰ مُعَاوِیَۃَ رضی اللہ عنہ سَلَامٌ عَلَیْکَ أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: "إِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ ثَلَاثًا

وَنَهَى عَنْ ثَلَاثٍ حَرَّمَ عُقُوقَ الْوَالِدِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَمَنْعًا وَهَاتِ وَنَهَى عَنْ ثَلَاثٍ، قِيلَ وَقَالَ وَكَثْرَةِ السُّؤَالِ وَإِضَاعَةِ الْمَالِ"(۱)

چھوٹے سے علم سیکھنا

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ مجھے کوئی ایسی بات لکھ کر بھیجیے جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے حاکم تھے اور بعد میں پورے عالم اسلام کے خلیفہ بن گئے اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ایک مخصوص علاقہ کے گورنر تھے، دونوں صحابی ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جو بظاہر ان کے ماتحت ہیں۔

اس خط میں یہ لکھا کہ آپ مجھے کچھ ایسی باتیں لکھ کر بھیجیے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے سنی ہوں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ ایک طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود صحابی ہیں اور صحابی بھی وہ جو کاتبِ وحی ہیں، یعنی ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں کہ جب کوئی وحی نازل ہوتی اور قرآنِ کریم کی کوئی سورت یا آیت نازل ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآنِ کریم لکھوایا کرتے تھے ان میں سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں، تو خود صحابی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنی ہیں، اس کے باوجود دوسرے صحابی سے

(۱) صحیح مسلم ۱۳۴۱/۳ (۵۹۳) وصحیح البخاری ۱۲۰/۳ (۲۴۰۸)۔

محتاج بن کر پوچھ رہے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو وہ مجھے بتایئے۔

علم احتیاج چاہتا ہے

آج اگر کوئی دو آدمی ہم مرتبہ بھی ہوں، ایک ہی استاذ کے شاگرد ہوں، ایک ہی شیخ کے مرید ہوں، دونوں نے اپنے اپنے استاذ اور شیخ کی صحبتیں اٹھائی ہوں، تو ہر ایک اپنے کو دوسرے سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ مجھے بھی وہی بات حاصل ہے جو اس دوسرے کو حاصل ہے، لیکن حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اپنے آپ کو اس معاملہ میں ہمیشہ محتاج سمجھتے تھے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ دوسرے نے کوئی ایسی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لی ہو جو میں نہیں سن سکا، اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ نے جو بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو وہ مجھے بتایئے تاکہ میرے علم میں اضافہ ہو۔ معلوم ہوا کہ علم نہ کسی کی جاگیر ہے اور نہ کسی کی جائیداد ہے اور نہ کوئی شخص علم کے معاملے میں کبھی بے نیاز ہوسکتا ہے۔ ہمیشہ انسان کو طالب علم رہنا چاہیے کہ ہر وقت اس کے اندر یہ طلب رہے اور یہ جستجو رہے کہ میرے علم میں اضافہ ہو، چاہے اس کے لیے مجھے کسی چھوٹے ہی سے رجوع کرنا پڑے، لیکن اس کے ذریعے اگر میرے علم میں اضافہ ہوجائے تو یہ میرے لیے سعادت کی بات ہے۔ لہٰذا کبھی علم کے معاملے میں اور دین کے معاملے میں اپنے آپ کو بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیے۔

جو لوگ اپنے آپ کو بڑا عالم سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا علم حاصل کرلیا، ان کے اندر یہ روگ اور بیماری ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے علم حاصل کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہیں کہ مجھے اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ بعض اوقات چھوٹے کے دل پر وہ بات جاری فرمادیتے ہیں جو بڑوں کے دل میں نہیں آتی۔

حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور طلبِ علم

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتیٔ اعظم پاکستان، جن کی ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری، دارالعلوم دیوبند میں پڑھا اور وہیں پڑھایا، وہاں دارالافتاء کے صدر مفتی رہے۔ ایک دن فرمانے لگے:

> ''میں جب کبھی کہیں جارہا ہوتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی واعظ وعظ کہہ رہا ہے یا تقریر کررہا ہے، چاہے کتنی ہی جلدی میں ہوں لیکن تھوڑی ہی دیر کو اس کی بات سننے کے لیے ضرور کھڑا ہوجاتا ہوں۔ اس لیے کہ کیا پتا اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی زبان پر کوئی ایسی بات جاری فرمادے جو میرے لیے فائدہ مند ہوجائے۔''

یہ کون کہہ رہا ہے؟ مفتیٔ اعظم پاکستان جن کے پاس لوگ دن رات دین حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، بڑے بڑے علماء اپنی مشکلات کو حل کرانے کے لیے آتے ہیں۔ یہ ہے علم کی طلب، حالانکہ عام طور پر ان کے زمانے میں

جو واعظ وعظ کہا کرتے تھے وہ سب ان کے چھوٹے، ان کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد کے شاگرد ہوتے تھے، لیکن اس لیے تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے کہ شاید ان کے منہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی ایسی بات کہلوادے جو میرے علم میں نہ ہو اور اس سے مجھے فائدہ پہنچے۔

حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قولِ زرّیں

اور پھر فرمایا کہ

"بھائی! درحقیقت علم عطا کرنا اور فائدہ پہنچانا، یہ نہ استاذ کا کام ہے اور نہ واعظ کا کام ہے، نہ مقرر کا کام ہے، یہ تو کسی اور کی عطا ہے۔ علم تو وہ (اللہ) دینے والا ہے وہ کسی بھی ذریعے سے دے دے، کسی کو بھی واسطہ بنادے، اگر کوئی آدمی طالب بن کر طلبِ صادق لے کر جاتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ استاذ کے دل پر ایسی بات جاری فرمادیتے ہیں جو اس کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، ورنہ کسی میں مجال ہے کہ وہ دوسرے کو کوئی نفع پہنچادے، کائنات میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی ذات سے دوسرے کو فائدہ پہنچادے جب تک اللہ جل جلالہ کی توفیق نہ ہو اور جب تک اللہ تبارک و تعالیٰ ارادہ نہ فرمائیں۔ وہ اگر چاہیں تو ایک جملہ سے فائدہ پہنچادیں اور وہ نہ چاہیں تو لمبی چوڑی تقریریں بے کار رہ جائیں۔"

اس لیے ہمیشہ ہمارے بزرگوں کا یہ مقولہ رہا ہے کہ

''طالب کی طلب کی برکت سے کہنے والے کے دل میں اور اس کی زبان پر اللہ تعالیٰ ایسی بات جاری فرمادیتے ہیں کہ سننے والوں کے لیے فائدہ مند ہوجاتی ہے۔''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی مجلس کی برکات

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین) ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کی مجلس میں جانے والے اگر دل میں کوئی کھٹک لے کر جائیں یا کوئی سوال لے کر جائیں اور پھر چاہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاکے ویسے ہی خاموش بیٹھ جائیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کی زبان پر وہ بات جاری ہوجائے گی اور کھٹک دور ہوجائے گی۔ چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن خود فرمایا کہ

''لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ میری کرامت ہے کہ میری زبان سے ان کے سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ سوال کا جواب دینا اور سوال کرنے والے کی تشفی کرنا یہ تو اللہ جل جلالہ کا کام ہے، جب کوئی بندہ طالب بن کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہنے والے کے دل میں خود سے وہ بات ڈال دیتے ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ اس کو میرے سوال کا پتا چل گیا ہے اور اس نے یہ بات کہہ دی اور بعض اوقات غلو کرکے اس کے بارے میں لوگ

یہ کہنا شروع کردیتے ہیں کہ اس کو کشف ہوتا ہے، کوئی الہام ہوتا ہے، کوئی علمِ غیب حاصل ہے (العیاذ باللہ) حالانکہ کسی کو نہ کچھ علمِ غیب ہے اور نہ اپنی ذات کے اندر کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ طالب کی طلب کی برکت سے اس کی زبان پر وہ بات جاری فرما دیتے ہیں۔"

بہرحال! یہ طلب بڑی چیز ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا و پست

کہ پانی کم ڈھونڈو، پیاس زیادہ پیدا کرو، جب پیاس زیادہ پیدا ہوگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اوپر اور نیچے سے تمہارے لیے پانی ابال دیں گے۔

تو یہ پیاس بڑی عجیب وغریب چیز ہے، جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو عطا فرمادیتے ہیں تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ مختلف ذرائع سے اس کی پیاس کو بجھانے کا سامان فرمادتے ہیں، لیکن اصل چیز طلب ہے۔

آگ مانگنے کا واقعہ

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ اس کی مثال دیتے تھے کہ ایک عورت تھی، اس کے گھر میں آگ کی ضرورت تھی۔ پہلے زمانے میں آگ جلانا ایک مسئلہ ہوتا تھا، اب تو ذرا سا چولہے کا بٹن دبایا اور آگ جل گئی، لیکن پہلے زمانہ میں آگ جلانا ایک مسئلہ ہوتا تھا، پہلے جنگل سے لکڑیاں جمع

کر کے لاؤ، پھر ان کو جلاؤ، پھونکنی سے اس کے اندر پھونک مارو، تب جا کر کہیں آگ سلگتی تھی اور اس میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ تو عورتیں یہ کرتی تھیں کہ جب آگ کی ضرورت ہوتی اور اپنے گھر میں آگ نہ ہوتی تو اپنی پڑوسن سے مانگ لیتی تھیں کہ بہن! اگر تمہارے ہاں آگ جل رہی ہو تو ایک انگارہ دے دو، پھر وہ کڑچھے میں آگ لے کر اپنے چولھے کو جلالیا کرتی تھیں۔

بہر حال، اس عورت نے اپنی پڑوسن سے کہا کہ بی بی! میرے گھر میں آگ ختم ہوگئی ہے، اگر تمہارے گھر میں ہو تو دے دو۔ پڑوسن نے کہا کہ بی بی میں ضرور دیتی مگر میرا چولہا تو خود ہی ٹھنڈا ہے، چولہے میں آگ نہیں ہے۔ مانگنے والی نے کہا اگر اجازت دو تو میں ذرا راکھ کو کرید کر دیکھ لوں؟ ہوسکتا ہے کوئی چنگاری مل جائے، پڑوسن نے کہا کہ ہاں دیکھ لو! چنانچہ اس عورت نے چولہے کی راکھ کو کرید کر دیکھا تو اندر ایک چھوٹی سی چنگاری مل گئی، تو خاتون نے کہا مجھے تو چنگاری مل گئی، میرا مقصد حاصل ہوگیا اور میں اس سے اپنا کام چلالوں گی، وہ لے کر چلی گئی اور جا کے اس سے آگ جلالی۔

طلب کی چنگاری پیدا کرو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اس نے جب چولہے کو کریدا تو کریدنے کے نتیجے میں اندر سے چنگاری نکل آئی اور اس سے آگ بن گئی، لیکن اگر کوئی معمولی سی چنگاری بھی نہ ہوتی تو پھر اس کو ہزار کریدتی رہتی، مگر اس سے کچھ بھی نہ بنتا اور نہ آگ سلگتی، لیکن چونکہ چنگاری تھی تو اس کو کریدنے سے اور اس کو ذرا سا دوسری لکڑیوں پر استعمال

کرنے سے وہ آگ بن کر بھڑک گئی اور پورا چولہا جل پڑا۔ تو حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی استاذ یا شیخ کے پاس جاتا ہے تو اگر اندر چنگاری ہے تو شیخ اس کو کرید کر اس کو آگ بنادے گا، لیکن اگر اندر چنگاری ہی نہیں ہے تو وہ شیخ اور استاذ ہزار کریدتا رہے اور ہزار اس کے اندر محنت کرتا رہے، مگر چونکہ اندر چنگاری ہے نہیں، اس لیے وہ آگ نہیں بنتی اور یہ چنگاری طلب کی چنگاری ہے، جستجو کی چنگاری ہے۔ اگر انسان کے اندر علم حاصل کرنے کی طلب ہو، اس کے بعد وہ استاذ کے پاس جائے گا تو وہ کرید ے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ چنگاری آگ بن جائے گی، لیکن اگر طلب ہی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تو یہ درحقیقت اللہ جل جلالہ کی سنت ہے کہ جب کوئی بندہ کسی کے پاس طلب لے کر جاتا ہے تو دینے والے تو وہ ہیں، قلب پر وہ جاری فرمادیتے ہیں۔

درس کے دوران طلب کا مشاہدہ

جو لوگ دین کے علوم پڑھاتے ہیں، ان کو اس بات کا تجربہ ہے۔ مثلاً رات کو اگلے دن پڑھانے والے سبق کا مطالعہ کیا، اس کی تیاری کی، تیاری کرکے درس گاہ میں گئے، جب پڑھانا شروع کیا تو عین سبق کے دوران ایسی بات دل میں آتی ہے کہ رات کو گھنٹوں تیاری کرنے کے باوجود ذہن میں نہیں آئی تھی، لیکن پڑھاتے پڑھاتے ذہن میں آگئی۔ وہ کہاں سے آئی ہے؟ وہ کسی طالب کی طلب کی برکت ہوتی ہے کہ کوئی طالب سچی طلب لے کر آیا تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی برکت سے وہ بات دل میں ڈال دی جو خود سے سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسی لیے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ بھائی! جب کوئی شخص وعظ کہہ رہا ہو تو اپنے آپ کو بے نیاز نہ سمجھو، کیا پتا اگر تم

سچی طلب لے کر گئے تو اس کی زبان سے اللہ تبارک و تعالیٰ ایسی بات جاری فرمادیں جو تمہارے لیے نفع کا سامان بن جائے!

کلام میں تاثیر من جانب اللہ ہوتی ہے

ایک اور بات حضرت فرماتے تھے وہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ جل جلالہ کی طرف سے معاملہ ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی بات میں اللہ تبارک و تعالیٰ ایسی تاثیر پیدا فرماتے ہیں کہ اس بات میں دوسرے وقت میں وہ تاثیر نہیں ہوتی، وہ بھی کسی طالب کی برکت ہے۔ کسی نے ایک وقت میں ایک جملہ کہا، اس کا ایسا اثر ہوا کہ دل پلٹ گیا، وہی جملہ کوئی دوسرا آدمی کسی دوسرے وقت میں کہہ دے تو بعض اوقات اس کا وہ اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ تو کیا پتا میں جس وقت جا رہا ہوں، اس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی زبان پر کوئی ایسی بات جاری فرمادیں جو اس لمحے میں میرے لیے مؤثر ہو۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ، آج ہم جن کو اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں، چنانچہ اولیائے کرام کا جو شجرہ ہے اس میں فضیل بن عیاض سرِ فہرست آتے ہیں۔ دراصل یہ ڈاکو تھے، ڈاکے ڈالا کرتے تھے اور ایسے ڈاکو تھے کہ مائیں بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں کہ بیٹا سو جاؤ ورنہ کہیں فضیل نہ آجائے اور قافلے گزرتے تھے اور یہ قافلوں کو لوٹتے تھے اور قافلے والے جب کہیں پڑاؤ ڈالتے تو کہتے تھے کہ یہ فضیل کا علاقہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ فضیل یا اس کے آدمی آکر ہمیں لوٹ لیں۔ ایک دن کسی کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے گئے، آخر شب کا وقت تھا،

وہاں اللہ کا کوئی بندہ قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہا تھا، قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہوئے یہ آیت تلاوت کی کہ

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (۱)

قرآنِ کریم کے بھی اندازِ خطاب عجیب وغریب ہوتے ہیں یعنی:

کیا ایمان والوں کے لیے اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے آگے پسیج جائیں اور اللہ نے جو حق بات نازل فرمائی ہے اس کے آگے وہ اپنے سر کو سرِ تسلیم خم کرلیں، کیا اب بھی وقت نہیں آیا۔

ڈاکہ ڈالنے جارہے ہیں اور ڈاکہ ڈالنے کے لیے کمند لگائی ہوئی ہے، کان میں قرآنِ کریم کی یہ آیت پڑگئی، بس اس لمحے میں اللہ تعالیٰ نے کیا تاثیر رکھی تھی، حالانکہ ہزار مرتبہ خود بھی یہ آیت پڑھی ہوگی، آخر کو مسلمان تھے، قرآن پڑھا ہی ہوگا، لیکن اس وقت میں جب اس آدمی کی زبان سے یہ آیت کریمہ سنی تو اس نے ایک انقلاب برپا کردیا، اسی وقت اسی لمحے دل میں آیا کہ میں ڈاکہ ڈالنا اور سارے غلط کام چھوڑتا ہوں اور وہیں سے یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ

"بَلٰی یَارَبِّ قَدْ آنَ"

اے پروردگار! اب وہ وقت آگیا۔

اور سارا ڈاکہ چھوڑ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وہ مقام بخشا کہ اتنے بڑے اولیا

(۱) سورۃ الحدید آیت (۱۶).

میں سے ہیں کہ آج سارے اولیاء اللہ کا شجرہ ان سے جا ملتا ہے۔[1]

کس لمحے میں کس آدمی کی زبان سے نکلی ہوئی کون سی بات اثر کر جائے یہ انسان پہلے سے اندازہ نہیں کرسکتا، اس لیے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی دوسرے کی نصیحت سے بے نیاز نہ سمجھیں، کیا معلوم! اللہ تبارک و تعالیٰ کس بات سے اصلاح فرمادیں، یہی معاملہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا۔

اب دیکھیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باوجود اونچے درجے پر ہونے کے اپنے ماتحت کو خط لکھ رہے ہیں کہ مجھے کوئی ایسی بات لکھیے جو آپ نے رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔

از دل خیزد بر دل ریزد

ان کے جواب میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ تکلف نہیں کیا کہ حضرت! آپ تو مجھ سے بڑے عالم ہیں، آپ کو میں کیا لکھوں بلکہ میں زیادہ محتاج ہوں، آپ مجھے لکھیے۔ اس قسم کے الفاظ نہیں لکھے، بلکہ یہ سوچا کہ جو میرے علم میں ہے وہ میں بتادیتا ہوں، چنانچہ انہوں نے بھی خط میں لکھ دیا۔ اب سنیے کیا حدیث لکھی:

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد خط میں لکھ کر بھیجا وہ تین سطریں بھی پوری نہیں ہیں، بلکہ ڈھائی سطروں میں آیا ہے۔ عام طور پر اگر کوئی آدمی سوچے کہ ایک بڑا آدمی مجھے کہہ رہا ہے کہ رسولِ کریم سرورِ دو

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر ۳۸۲/۴۸ وسیر اعلام النبلاء للذھبی ۴۳۳/۸ طبع الرسالة.

عالم ﷺ کا ارشاد مجھے لکھ کر بھیجو تو یہ اتنا بڑا آدمی ہے اس کو چھوٹی سی بات لکھ کر کیا بھیجوں؟ کوئی لمبی چوڑی تقریر ہو، کوئی لمبا چوڑا وعظ ہو، کوئی لمبے چوڑے ارشادات ہوں، لیکن انہوں نے ڈھائی سطروں میں مختصر سی بات لکھ کر بھیج دی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی مطمئن ہوگئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اعتبار اس کا نہیں ہے کہ کتنی لمبی بات کہی جارہی ہے، کتنا وقت لیا جارہا ہے؟ اعتبار اس کا ہے کہ کیا بات کہی جارہی ہے؟ وہ بات مختصر ہی سہی، لیکن نافع ہے تو اس کو انسان پلے باندھ لے اور اس پر عمل کرے تو اس کی نجات ہوجائے گی، لمبی چوڑی تقریروں کی حاجت نہیں، لمبے چوڑے بیانات کی بھی حاجت نہیں، لہٰذا اگر پوچھنے والے کے دل میں طلب ہو اور کہنے والے کے دل میں اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ ایک جملے سے فائدہ پہنچادیتے ہیں اور اگر (خدا نہ کرے) سننے والے کے دل میں طلب نہ ہو، یا کہنے والے کے دل میں اخلاص نہ ہو تو گھنٹوں تقریر کرتے رہو، ایک کان سے بات داخل ہوجائے گی اور دوسرے کان سے نکل جائے گی، دل پر اثر انداز نہیں ہوگی، لیکن جب اخلاص ہو تو چھوٹی بات بھی کارآمد ہوجاتی ہے۔

مختصر حدیث کے ذریعے نصیحت

چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے یہ چھوٹی سی حدیث بطورِ نصیحت لکھ کر بھیج دی کہ

نبی کریم ﷺ چھ چیزوں سے منع فرمایا کرتے تھے، مقصد یہ تھا کہ ان کو اگر پلے باندھ لو گے تو ان شاء اللہ اس سے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا

فائدہ پہنچ جائے گا، وہ چھ چیزیں کیا ہیں جن سے منع فرمایا؟

چھ چیزیں

وہ چھ چیزیں یہ ہیں:

۱۔عَنْ قِيْلَ وَقَالَ

قیل و قال سے اور فضول بحث و مباحثہ سے منع فرماتے تھے۔

۲۔وَاِضَاعَةِ المَالِ

اور مال کو ضائع کرنے سے منع فرماتے تھے۔

۳۔وَكَثْرَةِ السُّوَالِ

اور سوال کی کثرت سے کہ ہر وقت آدمی سوال ہی کرتا رہے، اس سے منع فرماتے تھے۔

٤۔وَعَنْ مَنْعٍ وَهَاتِ

اور اس بات سے منع فرماتے کہ آدمی دوسروں کو تو دے نہیں اور خود مانگتا رہے۔

٥۔وَعُقُوْقِ الْاُمَّهَاتِ

اور ماؤں کی نافرمانی سے منع فرماتے تھے۔

٦۔وَعَنْ وَأدِ الْبَنَاتِ

اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع فرماتے تھے۔

یہ چھ چیزیں لکھ کر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بھیجیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں سے منع فرمایا۔ اب ان چھ چیزوں کی تھوڑی سی تفصیل سن لیجیے۔

پہلی چیز: فضول بحث و مباحثہ

پہلی چیز کہ جس سے رسول کریم سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ ''قیل و قال'' ہے، یعنی فضول بحث و مباحثہ جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، اسی میں فضول کی گفتگو بھی داخل ہے، یہ ایسی چیز ہے کہ جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ اب بظاہر تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہو رہی ہے، وقت گزاری ہو رہی ہے اور فضول گفتگو ہو رہی ہے، بحث و مباحثہ کسی بات پر چل رہا ہے۔

وقت کی قدر کرو

لیکن اس لیے منع فرمایا کہ اللہ جل جلالہ نے ہمیں اور آپ کو جو زندگی عطا فرمائی ہے، اس کا ایک ایک لمحہ بڑی عظیم دولت ہے، ایک ایک لمحہ اس کا قیمتی ہے، کچھ پتا نہیں کب یہ زندگی چھن جائے اور کب ختم ہو جائے اور یہ اس لیے ملی ہے تاکہ انسان اس زندگی کے اندر اپنی آخرت کی بہتری کا سامان کرے، جس انسان کے اندر ذرا بھی عقل ہوگی وہ اپنی زندگی کے لمحات کو اور اس قیمتی دولت کو اصل مقصد کے حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے گا اور بے کار اور بے مصرف کاموں میں خرچ کرنے سے بچائے گا۔ اب فرض کرو کہ اگر کسی نے ایسا کام کر لیا یا وقت کو ایسے کام میں صرف کر لیا جس کا فائدہ نہ دنیا میں ہے نہ دین میں ہے، تو بظاہر تو لگتا ہے کہ کوئی گناہ کا کام نہیں ہے، لیکن اسی وقت کو اگر وہ صحیح

مصرف میں خرچ کرتا تو آخرت کی کتنی نیکیاں اور کتنا اجر وثواب جمع کر لیتا۔

گویائی عظیم نعمت

اسی طرح اللہ جل جلالہ نے ہمیں اور آپ کو گویائی کی قوت عطا فرمائی ہے۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ساری عمر انسان سجدے میں پڑا رہے تو بھی اس کا شکر ادا نہ ہو، ان لوگوں سے پوچھو جو اس گویائی کی قوت سے محروم ہیں، جو بولنا چاہتے ہیں مگر بول نہیں سکتے، اپنے دل کی بات کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے، ان کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں کہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کچھ کہہ دیں، مگر کہنے سے محروم ہیں۔ ان سے پوچھو کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے، اور یہ نعمت ایسی ہے کہ انسان اگر اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرے تو نیکی کا پلڑا بھر جاتا ہے اور کتنا اجر وثواب حاصل ہوتا ہے اور اسی کو انسان اگر غلط کام میں خرچ کرے، مثلاً گناہ کی بات میں، جھوٹ میں، غیبت میں، دل آزاری میں، تو یہ چیز ایسی ہے کہ اس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ

> ''انسان کو جہنم کے اندر اوندھے منہ گرانے والی کوئی چیز اس سے زیادہ سخت نہیں ہے جتنی انسان کی زبان ہے۔ (۱)''

یہ زبان سب سے زیادہ انسان کو اوندھے منہ گرائے گی۔ اگر زبان قابو میں نہیں ہے، جھوٹی بات زبان سے نکل رہی ہے، غیبتیں نکل رہی ہیں، دل آزاری

---

(۱) سنن الترمذی ٣٦٢/٤ (٢٦١٦) وقال هذا حديث حسن صحيح۔ والسنن الكبرى للنسائی ٢١٤/١٠ (١١٣٣٠) طبع الرسالہ۔

کی باتیں نکل رہی ہیں تو وہ انسان کو جہنم میں لے جائیں گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت

حضورِ اقدس سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم، جو ہم پر ماں باپ سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر تم نے اس زبان کو فضول بحث ومباحثے میں خرچ کرنا شروع کر دیا، جس کا نہ دنیا میں فائدہ ہے اور نہ آخرت میں فائدہ ہے، تو تم ایک بڑی دولت کو بلا وجہ ضائع کرنے والے ہوگے۔ کیونکہ جب انسان بحث ومباحثے میں پڑے گا تو کبھی جھوٹ بھی نکلے گا، غیبت بھی ہوگی، کبھی اور بھی باتیں ہوں گی اور فضول باتوں میں لگا ہوگا، تو گناہ میں بھی مبتلا ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان صحیح مصرف میں زبان استعمال کرنے سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔ (العیاذ باللہ) اس لیے قیل وقال اور فضول بحث ومباحثے سے اجتناب کرو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور بزرگانِ دین کا طرزِ عمل

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی وجہ سے فضول بحث ومباحثے کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ اس قول پر عامل تھے کہ

"قُلْ خَیراً أَوْ اِلَّا فَاصْمُتْ"(۱)

یا تو اچھی بات کہو ورنہ خاموش رہو۔

چنانچہ وہ فضولیات کے اندر پڑتے نہیں تھے اور ہمارے جو بزرگ اولیاء اللہ گزرے ہیں، ان کے ہاں جب کوئی اصلاح کرانے کے لیے جاتا تھا تو

---

(۱) صحیح البخاری ۳۲/۸ (۶۱۳۶) وصحیح مسلم ۶۸/۱ (۴۷)۔

اصلاح کے اندر پہلا قدم یہ ہوتا تھا کہ زبان قابو میں کرو اور فضول بحث ومباحثے سے اجتناب کرو۔

اصلاح کا ایک واقعہ

پہلے بھی شاید آپ کو واقعہ سنایا تھا کہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے تھے، دہلی میں ان کی بڑی شہرت تھی، اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کا بڑا فیض پھیلایا، دو طالبِ علم بلخ سے آپ کی شہرت سن کر حاضر ہوئے، حضرت سے بیعت ہونے اور اصلاح کرانے کا ارادہ تھا، جب حضرت کی مسجد میں پہنچے تو نماز کا وقت ہو رہا تھا وہ وضو کرنے بیٹھ گئے۔ ایک طالب دوسرے سے کہنے لگا کہ یہ حوض جس سے ہم وضو کر رہے ہیں یہ بڑا ہے یا وہ جو ہمارے بلخ میں ہے؟ تو دوسرے نے کہا کہ وہ بلخ والا بڑا ہے، اس نے کہا کہ میرے خیال میں یہ دہلی کا حوض بڑا ہے۔

اب اس موضوع پر دونوں کے درمیان دلائل کا تبادلہ شروع ہوا، ایک کہہ رہا ہے وہ بڑا ہے دوسرا کہہ رہا ہے یہ بڑا ہے۔ حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی وہیں وضو فرما رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ یہ دونوں آدمی اس طرح بحث کر رہے ہیں۔ جب نماز ہوگئی تو یہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے سوال کیا کہ ''کیسے آنا ہوا؟'' انہوں نے کہا: ''حضرت! آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے اور بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔'' حضرت نے فرمایا: ''پہلے یہ طے کرلو کہ ہماری مسجد کا حوض بڑا ہے یا بلخ کا حوض بڑا ہے۔ یہ مسئلہ طے کرلو تو پھر آگے بات چلے۔'' اب وہ بڑے شرمندہ ہوئے، لیکن حضرت نے فرمایا کہ جب تک یہ اہم مسئلہ طے نہ ہو اس وقت تک بیعت کرنا فضول

ہے۔ لہٰذا پہلے اس حوض کو ناپو، پیمائش کرو اور پھر واپس جا کر اس حوض کو ناپو، اس کے بعد فیصلہ کرو کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے، جب یہ کام کرلو گے تو پھر تمہیں بیعت کریں گے۔

اور پھر فرمایا کہ تمہاری اس گفتگو سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ فضول بحث و مباحثہ کرنے کی عادت ہے جس کا کوئی مصرف نہیں اور دوسری بات یہ کہ بات میں تحقیق نہیں، آپ نے ویسے ہی اندازے سے دعویٰ کرلیا کہ یہ بڑا ہے اور آپ نے ویسے ہی اندازہ سے دعویٰ کرلیا کہ وہ بڑا ہے، تحقیق کسی نے کی نہیں، تو معلوم ہوا کہ زبان سے بات کرنے میں تحقیق نہیں اور فضول بحث و مباحثے کی عادت ہے، اس کی موجودگی میں اگر آپ کو کچھ ذکر و اذکار بتاؤں گا تو کچھ حاصل نہیں ہوگا، جب تک یہ عادت ختم نہ ہو اور یہ عادت اسی طرح ختم ہوگی کہ ایک مرتبہ تمہیں سبق مل جائے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا واپس جاؤ اور پیمائش کرنے کے بعد پھر واپس آنا تو بات چلے گی۔

آج کل کی پیری مریدی

اب آج کل تو پیری مریدی یہ ہوگئی ہے کہ کچھ اذکار بتادیے اور کچھ وظائف بتادیے اور خواب کی تعبیر بتادی اور یہ بتادیا کہ فلاں مقصد کے لیے یہ پڑھو اور فلاں مقصد کے لیے یہ پڑھو، یہ پیری مریدی ہوگئی۔ حالانکہ پیری مریدی کا اصل مقصد تھا ''اصلاحِ نفس''۔ اب ان کو ساری عمر کے لیے ایسی نصیحت ہوگئی کہ اب آئندہ کسی فضول بحث میں نہیں پڑیں گے۔ ارے بھائی! اگر یہ پتا بھی چل جائے کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے تو کیا حاصل؟ دنیا میں کیا فائدہ ہوا؟ اور آخرت میں کیا فائدہ؟ اس لیے یہ چیز انسان کو خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کی

طرف لے جاتی ہے اور بالآخر گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ایسا سبق دے دیا کہ آئندہ کبھی عمر بھر بحث نہیں کی ہوگی۔

مذہبی بحث ومباحثہ

بعض اوقات یہ بحث و مباحثہ مذہب کے نام پر اور دین کے نام پر ہوتا ہے، ایسے سوالات جو نہ قبر میں پوچھے جائیں گے، نہ حشر میں اور نہ نشر میں، نہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اس کی باز پرس ہوگی، اس کے اوپر لمبی چوڑی بحث چل رہی ہے اور مناظرے ہو رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں اِدھر کا بھی وقت برباد ہو رہا ہے اور ادھر کا بھی وقت برباد ہو رہا ہے۔ یہ بحث اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''إِنَّ المِرَاءَ يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ ''(۱)

یہ بحث ومباحثہ علم کے نور کو زائل کر دیتا ہے، علم کا نور ختم کر دیتا ہے۔

فالتو عقل والے

اکبر الہ آبادی مرحوم جو طنزیہ شاعر ہیں لیکن بعض اوقات بڑے حکیمانہ اشعار کہہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مطلب یہ ہے کہ فضول بحث ومباحثہ کا کام وہ کرے جس کے پاس فالتو

---

(۱) فتح الباری لابن حجر ۱۳/۲۶۳۔

عقل ہو اور فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں۔ جس مسئلے کا سوال نہ قبر میں ہوگا، نہ حشر میں، نہ نشر میں، نہ اللہ تبارک و تعالیٰ کبھی پوچھیں گے اور اس کے بارے میں لمبی چوڑی بحثیں کر رہے ہیں، اس کے اندر وقت کو ضائع کر رہے ہیں، حالانکہ نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''قیل و قال'' سے اور فضول بحث و مباحثے سے منع فرمایا ہے اور افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے اندر یہ فضول بحث و مباحثہ بے انتہا پھیل گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو دین کے ضروری مسائل اور احکام تھے اس سے تو لوگ جاہل رہ گئے، اس کا پتا نہیں اور فضول بحثوں کے اندر پڑے ہیں، تاریخی بحثوں کے اندر مبتلا ہیں۔ مثلاً اب اس میں بحث ہو رہی ہے کہ یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں ہوگی؟ وہ فاسق تھا کہ نہیں تھا؟ بھائی! تم سے کوئی قبر میں اس کے بارے میں پوچھے گا؟ یا تم سے پوچھ کر اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کریں گے؟ یا تمہارے اوپر اس کے اعمال کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے اس بات پر بحث ہو رہی ہے کہ اس کی مغفرت ہوگی یا نہیں ہوگی؟

یزید کے فسق کے بارے میں سوال کا جواب

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ حضرت! یزید فاسق تھا یا نہیں تھا؟ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی میں کیا جواب دوں کہ فاسق تھا یا نہیں تھا؟ مجھے تو اپنے بارے میں فکر ہے کہ پتا نہیں میں فاسق ہوں یا نہیں، مجھے تو اپنی فکر ہے کہ پتا نہیں میرا کیا انجام ہونا ہے، دوسروں کے بارے میں مجھے کیا فکر جو اللہ تعالیٰ کے پاس جا چکے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ

وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ [1]

یہ امت ہے جو گزر گئی، ان کے اعمال ان کے ساتھ
تمہارے اعمال تمہارے ساتھ، ان کے اعمال کے
بارے میں تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

بہرحال! کیوں اس بحث کے اندر پڑ کر اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہو اور دوسروں کا وقت بھی ضائع کرتے ہو کہ کس کی مغفرت ہوگی اور کس کی نہیں ہوگی؟ اس قسم کے بے شمار مسائل ہمارے معاشرے کے اندر کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اور اس پر قیل و قال ہو رہی ہے، بحثیں ہو رہی ہیں، مناظرے ہو رہے ہیں، کتابیں لکھی جا رہی ہیں، وقت برباد ہو رہا ہے۔ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فضول کی بحثوں سے منع فرمایا ہے۔

سوالات کی کثرت سے ممانعت

دوسرا لفظ بھی اس کے ساتھ ہے وہ ہے "وکثرة السوال" سوالوں کی کثرت سے منع فرمایا۔ جس آدمی کو اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ جو کام کی بات ہے وہ کرے اور فضول باتوں سے اجتناب کرے، اس کے دل میں سوالات بہت پیدا ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے سوال کرتا رہتا ہے۔ سوال وہ کرو جس کا تعلق تمہاری عملی زندگی سے ہے۔ سوال وہ کرو جس کے بارے میں تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ کام کروں یا نہ کروں؟ باقی ماضی کے بارے میں سوالات اور دوسری فضول باتوں کے بارے میں سوالات، ان کا کچھ حاصل نہیں۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱۳٤).

احکام کی حکمتوں کے بارے میں سوالات

میں یہاں خاص طور پر دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ دین کے احکام کی حکمتوں کے بارے میں لوگ بکثرت سوالات کرتے ہیں کہ فلاں چیز حرام کیوں ہے؟ فلاں چیز منع کیوں ہے؟ دین کے معاملے میں یہ کیوں ہے؟ ہمارے معاشرے میں یہ سوالات بہت پھیل گئے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات پڑھو گے تو یہ نظر آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سوالات کرتے تھے، لیکن اس میں ''کیوں'' کا لفظ کہیں نہیں ملے گا۔ حضور اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ جو بات کر رہے ہیں یہ کیوں کر رہے ہیں؟ یا کوئی چیز یا فعل حرام کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟

ایک مثال

اب آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود حرام کیا، یعنی قرضہ دے کر اس کے اوپر زیادہ پیسے لینا سود ہے۔ قرآن نے اس کو حرام کہا اور کہا کہ جو یہ نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لے۔[1] اتنی زبردست وعید بیان فرمائی۔ اس کے بارے میں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سوال کیسے کرتے کہ یہ کیوں حرام ہے؟ یہاں تک کہ بعد میں جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سود کی حرمت کی طرف لے جانے والے کچھ معاملات کو بھی حرام کیا۔ مثلاً ایک بات یہ حرام کی کہ اگر کوئی شخص گندم کو گندم

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۹)۔

سے بیچ رہا ہے تو چاہے ایک طرف گندم اعلیٰ درجے کا ہو اور دوسری طرف معمولی درجے کا ہو تب بھی دونوں کا برابر ہونا ضروری ہے، اگر اعلیٰ درجے کا گندم دو سیر ہو اور ادنیٰ درجے کا گندم چار سیر ہو اور دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعے فروخت کیا جائے تو اس کو بھی آپ نے حرام اور ناجائز فرمایا یا مثلاً اچھی کھجور ایک سیر اور خراب کھجور دو سیر اگر آپس میں بیچی جائیں تو فرمایا کہ یہ بھی حرام ہے۔(۱)

اب بظاہر تو عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ایک اچھے درجے کا گندم ہے تو اس کی قیمت بھی زیادہ ہے، اس کا فائدہ بھی زیادہ ہے اور جو ادنیٰ درجے کا گندم ہے اس کی قیمت بھی کم ہے اور اس کا فائدہ بھی کم ہے تو اگر ادنیٰ درجے کے دو سیر اور اعلیٰ درجے کا ایک سیر ملا کر فروخت کیا جائے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ لیکن جب نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ گندم کی بیع جب گندم سے ہوگی تو برابر برابر ہونا چاہیے، چاہے اعلیٰ درجے کا ہو یا ادنیٰ درجے کا ہو، کسی ایک صحابی (رضی اللہ عنہ) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم سن کر نہیں فرمایا کہ یا رسول اللہ! کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ جبکہ وہ اعلیٰ ہے اور یہ ادنیٰ ہے۔ وجہ یہ تھی کہ لفظ ''کیوں'' کا سوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہاں نہیں تھا، اس لیے کہ انہیں اللہ تعالیٰ پر اور نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا بھروسا تھا کہ جو حکم یہ دے رہے ہیں وہ برحق ہے، ہماری سمجھ میں آئے تو برحق ہے، نہ آئے تو برحق ہے، ہمیں حکمت کے پیچھے پڑنے کی حاجت نہیں، جب ہمیں کہہ دیا کہ حرام ہے تو حرام ہے۔

یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا طریقہ۔ آج سب سے زیادہ ''کیوں'' کا سوال ہے۔ آج جو گندم کی بات میں عرض کررہا ہوں، یہ کسی کے سامنے عرض

---

(۱) صحیح مسلم ۱۲۱۱/۳ (۱۵۸۸)۔

کر کے دیکھ لو، وہ چھوٹتے ہی یہ کہے گا "کیوں؟ یہ کیوں ناجائز ہے؟" سب سے پہلے اس کا سوال یہی ہوگا اور اسے تو چھوڑ دو، آج کل جو قرض والا اصل سود ہے اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ حرام کیوں ہے؟

بہرحال! کثرتِ سوال ایک بڑی بیماری ہے۔ احکام شریعہ کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ یہ کیوں ہے؟ یہ سوال ٹھیک نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص ویسے ہی اپنی زیادتی اطمینان کے لیے پوچھے تو چلو گوارا ہے، لیکن اب تو باقاعدہ اسی لیے پوچھا جاتا ہے کہ اگر ہماری سمجھ میں اس کی وجہ آ گئی تو حرام سمجھیں گے اگر نہیں آئی تو حرام نہیں سمجھیں گے۔ اللہ بچائے یہ بات انسان کو بعض اوقات کفر تک لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ آمین۔ کثرتِ سوال میں ایک پہلو یہ ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنا جن کا انسان کے عقیدے سے یا اس کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، یا ایسے ہی فضول سوالات جیسے یہ سوال کہ یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ جنگ میں کون باطل پر تھا اور کون حق پر تھا؟ یا تاریخی واقعات کی تفصیلات پوچھنا اور ان کے اندر جھگڑا کرنا یا ایسے عقائد کے بارے میں سوالات کرنا جو بنیادی عقائد نہیں ہیں، جن کے بارے میں حشر نشر کے اندر کوئی سوال نہیں ہونا ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں سوالات کرنے کے بجائے جو تمہاری عملی زندگی کے معاملات ہیں، حرام و حلال کے، جائز و ناجائز کے، ان کے بارے میں سوال کرو اور ان کے اندر بھی جو سوالات ضروری ہیں، ان کے اندر اپنے آپ کو محدود رکھو۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو سوال بہت

کم کیا کرتے تھے، جتنی بات نبی کریم ﷺ سے سن لی، اس پر عمل کرتے تھے، سوال کم کرتے تھے، لیکن سوال جو کرتے تھے وہ عملی زندگی سے متعلق کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
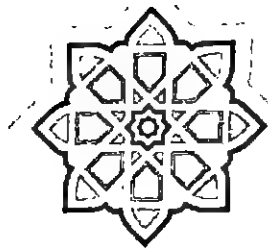
دین سیکھنے اور سکھانے کا طریقہ

(اصلاحی خطبات ج ۱۰ ص ۱۳۲)
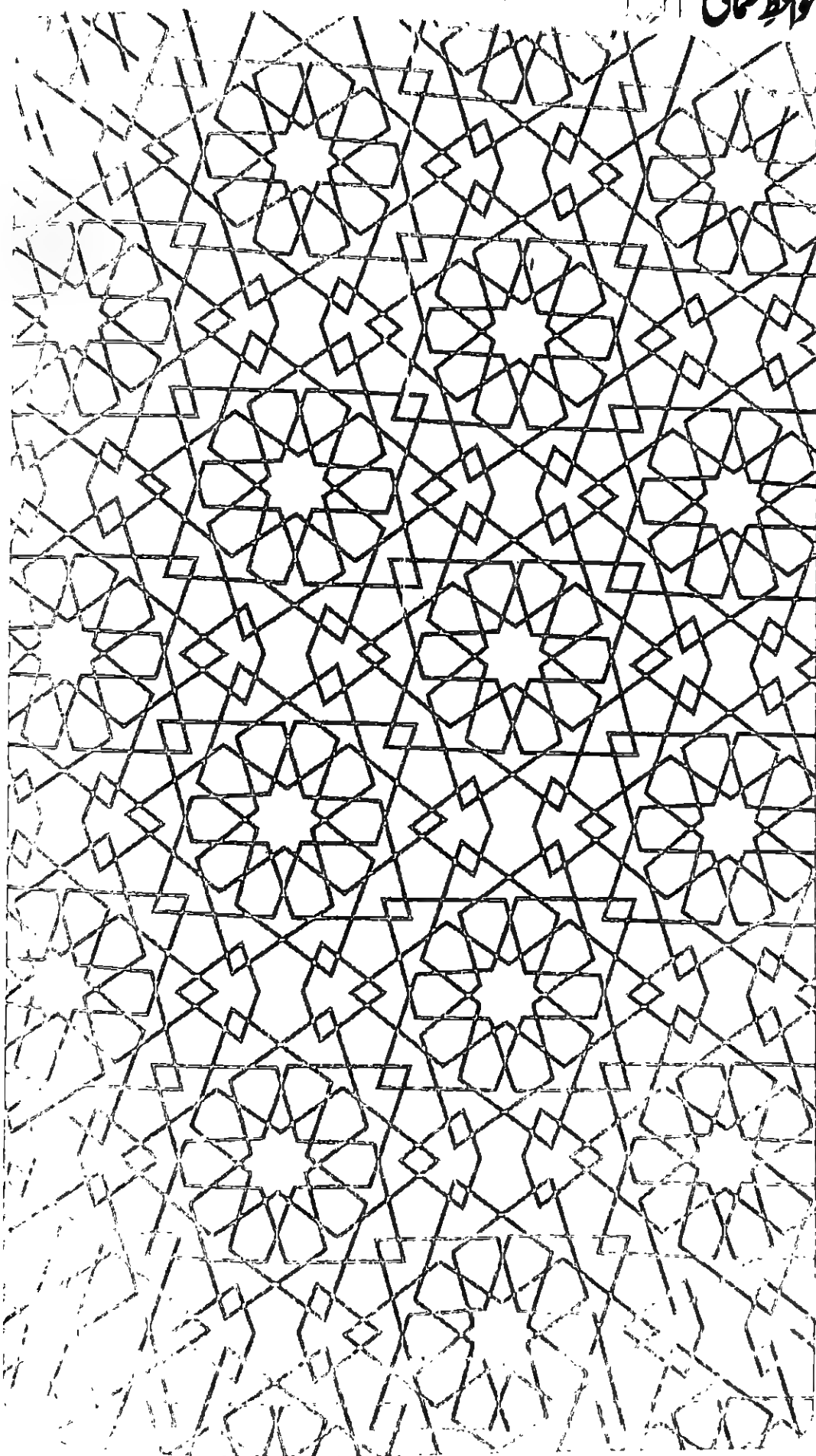
بسم اللہ الرحمن الرحیم

دین سیکھنے اور سکھانے کا طریقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا، أما بعد!

”عَنْ أَبِيْ قِلَابَةَ قَالَ حَدَّثَنَا مَالِكٌ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ أَتَيْنَا النَّبِيَّ ﷺ وَنَحْنُ شَبَبَةٌ مُتَقَارِبُوْنَ فَأَقَمْنَا عِنْدَهٗ عِشْرِيْنَ يومًا وليلةً وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَحِيْمًا رَفِيْقًا، فَلَمَّا ظَنَّ أَنَّا قَدِ اشْتَهَيْنَا

أهلنا، سألنا عمن تركنا بعدنا فأخبرناه فقال: «ارجعوا إلى أهليكم فأقيموا فيهم وعلموهم ومروهم، وصلوا كما رأيتموني أصلي، فإذا حضرت الصلوة فليؤذن لكم أحدكم وليؤمكم أكبركم»''(۱)

ترجمۂ حدیث

یہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں جو قبیلہ بنولیث کے ایک فرد تھے۔ ان کا قبیلہ مدینہ منورہ سے کافی دور ایک بستی میں آباد تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، یہ لوگ مسلمان ہوگئے۔ مسلمان ہونے کے بعد اپنے گاؤں سے سفر کرکے مدینہ منورہ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اپنی حاضری کا واقعہ اس طویل حدیث میں بیان فرمارہے ہیں کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور ہم لوگ سب نوجوان اور ہم عمر تھے اور ہم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیس دن قیام کیا۔ بیس دن کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ شاید ہمیں اپنے گھر والوں کے پاس جانے کی خواہش پیدا ہورہی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے پوچھا کہ تم اپنے گھر میں کس کس کو چھوڑ کر آئے ہو؟ یعنی تمہارے گھر میں کون کون تمہارے رشتے دار ہیں؟ ہم نے بتادیا کہ فلاں فلاں رشتے دار ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر انسان پر بڑے ہی مہربان اور بڑے ہی نرم خو تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ

(۱) صحیح البخاری ۱/۱۲۸ (۶۳۱)۔

''اب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ اور جا کر ان کو دین سکھاؤ اور ان کو حکم دو کہ وہ دین پر عمل کریں اور جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اسی طرح تم بھی نماز پڑھو اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان دیا کرے اور تم میں سے جو عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔''

یہ ہدایات دے کر پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رخصت فرمادیا۔

دین سیکھنے کا طریقہ ہے صحبت

یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس میں ہمارے لیے ہدایت کے متعدد سبق ہیں۔ سب سے پہلی بات جو حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی، وہ یہ تھی کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ہم نوجوان تھے اور تقریباً بیس دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ درحقیقت دین سیکھنے کا یہی طریقہ تھا۔ اس زمانے میں نہ کوئی باقاعدہ مدرسہ تھا اور نہ کوئی یونیورسٹی تھی، نہ کوئی کالج تھا اور نہ کتابیں تھیں۔ بس دین سیکھنے کا یہ طریقہ تھا کہ جس کو دین سیکھنا ہوتا وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آجاتا اور آکر آپ کو دیکھتا کہ آپ کس طرح زندگی گزار رہے ہیں؟ صبح سے لے کر شام تک آپ کے کیا معمولات ہیں؟ لوگوں کے ساتھ آپ کا رویہ کیسا ہے؟ آپ گھر میں کس طرح رہتے ہیں؟ باہر والوں کے ساتھ کس طرح رہتے ہیں؟ یہ سب چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو معلوم کرتے اور اسی سے ان کو دین سمجھ میں آتا۔

"صحبت" کا مطلب

اللہ تعالیٰ نے دین سیکھنے کا جو اصل طریقہ مقرر فرمایا ہے، وہ یہی صحبت ہے۔ اس لیے کہ کتاب اور مدرسہ سے دین سیکھنا تو ان لوگوں کے لیے ہے جو پڑھے لکھے ہوں اور پھر تنہا کتاب سے پورا دین بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ صرف کتاب پڑھ لینے سے اس کو کوئی علم و ہنر نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی علم صرف کتاب کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ علم و ہنر سیکھنے کے لیے صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ "صحبت" کا مطلب یہ ہے کہ کسی جاننے والے کے پاس کچھ دن رہنا اور اس کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرنا، اسی کا نام صحبت ہے اور یہی صحبت انسان کو کوئی علم و ہنر اور کوئی فن سکھاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کو ڈاکٹر بننا ہے تو اس کو کسی ڈاکٹر کی صحبت میں رہنا ہوگا۔ اگر کسی کو انجینئر بننا ہے تو اس کو کسی انجینئر (Engineer) کی صحبت میں رہنا ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کسی کو کھانا پکانا سیکھنا ہے تو اس کو بھی کچھ وقت باورچی کی صحبت میں گزارنا ہوگا اور اس سے سیکھنا پڑے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دین کا معاملہ رکھا ہے کہ یہ دین صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے کس طرح دین سیکھا؟

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب کبھی کوئی آسمانی کتاب دنیا میں بھیجی تو اس کے ساتھ ایک رسول ضرور بھیجا، ورنہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو براہِ راست کتاب نازل فرما دیتے، لیکن براہِ راست کتاب نازل کرنے کے بجائے ہمیشہ کسی رسول اور پیغمبر کے ذریعے کتاب بھیجی تاکہ وہ رسول اور پیغمبر اس کتاب پر عمل کرنے کا

طریقہ لوگوں کو بتائے اور اس رسول کی صحبت اور اس کی زندگی کے طرزِ عمل سے لوگ یہ سیکھیں کہ اس کتاب پر کس طرح عمل کیا جاتا ہے؟ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھیے کہ انہوں نے کس یونیورسٹی میں تعلیم پائی؟ وہ حضرات کون سے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے؟ انہوں نے کون سی کتابیں پڑھی تھیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے لیے نہ تو ظاہری طور پر کوئی مدرسہ تھا، نہ ہی ان کے لیے کوئی کورس مقرر تھا، نہ کوئی نصاب تعلیم تھا، نہ کتابیں تھیں، لیکن ایک صحابی کے طرزِ عمل پر ہزار مدرسے اور ہزار کتابیں قربان ہیں، اس لیے کہ اس صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی اور صحبت کے نتیجے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کو دیکھا اور پھر اس ادا کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ صحابی بن گئے۔

اچھی صحبت اختیار کرو

بہرحال! یہ صحبت ایسی چیز ہے جو انسان کو کیمیا بناتی ہے۔ اسی لیے ہمارے تمام بزرگوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر دین سیکھنا ہے تو پھر اپنی صحبت درست کرو اور ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو اور ایسے لوگوں کے پاس جاؤ جو دین کے حامل ہیں۔ وہ صحبت رفتہ رفتہ تمہارے اندر بھی دین کی عظمت و محبت اور اس کی فکر پیدا کرے گی اور اگر غلط صحبت میں بیٹھو گے تو پھر غلط صحبت کے اثرات تم پر ظاہر ہوں گے اور یہ دین حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تیار ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت سے تابعین تیار ہوئے اور تابعین کی صحبت سے تبع تابعین تیار ہوئے۔ یہ سارے دین کا سلسلہ اس وقت سے لے کر آج تک اسی طرح چلا آ رہا ہے۔

دو سلسلے

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دو سلسلے جاری فرمائے ہیں: ایک کتاب اللہ کا سلسلہ اور دوسرا رجال اللہ کا سلسلہ۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے اللہ کے آدمی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال پیدا فرمائے ہیں جو اس کتاب پر عمل کا نمونہ ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص دونوں سلسلوں کو لے کر چلے تو اس وقت دین کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے، لیکن اگر صرف کتاب لے کر بیٹھ جائے اور رجال اللہ سے غافل ہوجائے تو بھی گمراہی میں مبتلا ہوسکتا ہے اور اگر تنہا رجال اللہ کی طرف دیکھے اور کتاب اللہ سے غافل ہوجائے تو بھی گمراہی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔

اسی لیے ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ اس وقت دین کو حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سمجھ رکھتے ہیں اور دین پر عمل پیرا ہیں، جو شخص جتنی صحبت اختیار کرے گا وہ اتنا ہی دین کے اندر ترقی کرے گا۔ بہرحال! یہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہتے تھے، اس لیے یہ حضرات بیس دن نکال کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے اور ان بیس دنوں میں دین کی جو بنیادی تعلیمات تھیں وہ حاصل کرلیں، دین کا طریقہ سیکھ لیا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوگئے۔

اپنے چھوٹوں کا خیال

پھر خود ہی حضورِ اقدس ﷺ کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ نوجوان لوگ ہیں، یہ اپنے گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں، اس لیے ان کو اپنے گھر والوں کی یاد آتی ہوگی اور ان کو اپنے گھر والوں سے ملنے کی خواہش ہوگی، تو خود ہی حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اپنے گھر میں کس کس کو چھوڑ کر آئے ہو؟ ان میں سے کچھ ایسے نوجوان تھے جو نئے شادی شدہ تھے۔ جب انہوں نے بتایا کہ فلاں فلاں کو چھوڑ کر آئے ہیں تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اب تم اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔

گھر سے دور رہنے کا اصول

اس حدیث کے تحت علمائے کرام نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جو آدمی شادی شدہ ہو، اس کو کسی شدید ضرورت کے بغیر اپنے گھر سے زیادہ عرصے تک دور نہ رہنا چاہیے، اس میں خود اس کی اپنی بھی حفاظت ہے اور گھر والوں کی بھی حفاظت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا ہے جس میں تمام جہتوں اور تمام جانبوں کی رعایت ہے، یہ نہیں کہ ایک طرف کو جھکاؤ ہو گیا اور دوسرے پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، بلکہ اس دین اسلام کے اندر اعتدال ہے اور اسی لیے اس کو ﴿اُمَّةً وَسَطاً﴾ [1] (درمیانی امت) سے تعبیر فرمایا، لہٰذا ایک طرف تو یہ فرمادیا کہ دین سیکھنے کے لیے اچھی صحبت اٹھاؤ، لیکن دوسری طرف یہ بتادیا کہ ایسا نہ ہو کہ اچھی صحبت اٹھانے کے نتیجے میں دوسروں کے جو حقوق تمہارے ذمے

[1] سورۃ البقرۃ آیت (۱۴۳)۔

ہیں وہ پامال ہونے لگیں، بلکہ دونوں باتوں کی رعایت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان حضرات سے فرمایا کہ بیس دن تک یہاں قیام کرلیا اور ضروری باتیں تم نے ان ایام کے اندر سیکھ لیں، اب تمہارے ذمے تمہارے گھر والوں کے حقوق ہیں اور خود تمہارے اپنے حقوق ہیں، اس لیے تم اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔

دوسرے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ

اب آپ غور کریں کہ انہوں نے بیس دن میں دین کی تمام تفصیلات تو حاصل نہیں کرلی ہوں گی اور نہ ہی دین کا سارا علم سیکھا ہوگا، اگر حضورِ اقدس ﷺ چاہتے تو ان سے فرمادیتے کہ ابھی اور قربانی دو اور مزید کچھ دن یہاں رہو تاکہ تمہیں دین کی ساری تفصیلات معلوم ہوجائیں، لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ انہوں نے دین کی ضروری باتیں سیکھ لی ہیں، اب ان کو دوسرے حقوق کی ادائیگی کے لیے بھیجنا چاہیے۔

اتنا علم سیکھنا فرضِ عین ہے

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ دین کے علم کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ دین کا اتنا علم سیکھنا جو انسان کو اپنے فرائض اور واجبات ادا کرنے کے لیے ضروری ہے، مثلاً یہ کہ نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ نمازوں میں رکعتوں کی تعداد کتنی ہے؟ نماز میں کتنے فرائض اور واجبات ہیں؟ روزہ کیسے رکھا جاتا ہے اور کس وقت فرض ہوتا ہے؟ زکوٰۃ کب فرض ہوتی ہے اور کتنی مقدار میں کن افراد کو ادا کی جاتی ہے؟ اور حج کب فرض ہوتا ہے؟ اور یہ کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی چیز حرام ہے؟ مثلاً جھوٹ بولنا حرام ہے، غیبت کرنا حرام ہے، شراب

پینا حرام ہے، خنزیر کھانا حرام ہے، یہ حلال و حرام کی بنیادی موٹی موٹی باتیں سیکھنا، لہٰذا اتنی معلومات حاصل کرنا جس کے ذریعے انسان اپنے فرائض و واجبات ادا کر سکے اور حرام سے اپنے آپ کو بچا سکے، ہر مسلمان مرد و عورت کے ذمے فرضِ عین ہے۔ یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ"(۱)

یعنی علم کا طلب کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) کے ذمے فرض ہے۔ اس سے مراد یہی علم ہے۔

اتنا علم حاصل کرنے کے لیے جتنی بھی قربانی دینی پڑے قربانی دے۔ مثلاً والدین کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑے۔ بیوی کو اور بہن بھائیوں کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑے، اس لیے کہ اتنا علم حاصل کرنا فرض ہے، اگر کوئی یہ علم حاصل کرنے سے روکے، مثلاً ماں باپ روکیں، بیوی روکے، یا بیوی کو شوہر روکے تو ان کی بات ماننا جائز نہیں۔

(۱) سنن ابن ماجه ج۱ص۲۱٤ (۲۲٤) طبع دار الجيل. ومسند البزار ج ۱۳ص ۲٤۰ (٦۷٤٦) طبع مكتبة العلوم والحكم. والحديث ذكره السخاوى فى "المقاصد الحسنه" ص ٤٤۰ رقم ٦٦۰-طبع دار الكتاب العربى-وقال: ابن ماجه فى سننه، وابن عبد البر فى العلم له، من حديث حفص بن سليمان، عن كثير بن شنظير، عن محمد بن سيرين، عن انس، مرفوعًا به ... وحفص ضعيف جدا، بل اتهمه بعضهم بالكذب والوضع، وقيل عن احمد: انه صالح، ولكن له شاهد عند ابن شاہين فى "الافراد"، ورويناه فى "ثانى السمعونيات" من حديث موسى بن داود، حدثنا حماد بن سلمة، عن قتادة، عن انس، به، وقال ابن شاهين: انه غريب، قلت: رجاله ثقات، بل يروى عن نحو عشرين تابعيا عن انس...الخ۔

یہ علم فرضِ کفایہ ہے

علم کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی علم دین کی باقاعدہ پوری تفصیلات حاصل کرے اور باقاعدہ عالم بنے۔ یہ ہر انسان کے ذمے فرضِ عین نہیں ہے، بلکہ یہ علم فرضِ کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ عالم بن جائیں تو باقی لوگوں کا فریضہ بھی ادا ہوجاتا ہے۔ مثلاً ایک بستی میں ایک عالم ہے اور دین کی تمام ضروریات کے لیے کافی ہے، تو ایک آدمی کے عالم بن جانے سے باقی لوگوں کا فریضہ بھی ساقط ہوجائے گا اور اگر کوئی بڑی بستی ہو یا شہر ہو تو اس کے لیے جتنے علماء کی ضرورت ہو اس ضرورت کے مطابق اتنے لوگ عالم بن جائیں تو باقی لوگوں کا فریضہ ساقط ہوجائے گا۔

دین کی باتیں گھر والوں کو سکھاؤ

بہرحال! جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ ان حضرات نے فرضِ عین کے بقدر جو علم تھا وہ بیس دن میں حاصل کرلیا ہے اور اب ان کو مزید یہاں روکنے میں یہ اندیشہ ہے کہ ان کے گھر والوں کی حق تلفی نہ ہو، لہٰذا آپ نے ان حضرات سے فرمایا کہ اب اپنے گھروں کو واپس جاؤ، لیکن ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ یہ نہ ہو کہ گھر والوں کے پاس جاکر غفلت کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کردو، بلکہ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے یہاں رہ کر علم حاصل کیا اور جو کچھ دین کی باتیں یہاں سیکھیں وہ باتیں اپنے گھر والوں کو جاکر سکھاؤ۔ اس سے پتا چلا کہ ہر انسان کے ذمے یہ بھی فرض ہے کہ وہ جس طرح خود دین کی باتیں سیکھتا ہے اپنے گھر والوں کو بھی سکھائے۔ ان کو اتنی دین کی باتیں سکھانا جن کے ذریعے وہ صحیح معنوں میں مسلمان بن سکیں اور مسلمان رہ سکیں یہ تعلیم دینا بھی

ہر مسلمان کے ذمے فرضِ عین ہے اور یہ ایسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا فرض ہے، جیسے رمضان میں روزے رکھنا فرض ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا اور حج ادا کرنا فرض ہے۔ یہ کام جتنے ضروری ہیں اتنا ہی گھر والوں کو دین سکھانا بھی ضروری ہے۔

اولاد کی طرف سے غفلت

ہمارے معاشرے میں اس بارے میں بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے، سمجھ دار اور بظاہر دین دار لوگ بھی اپنی اولاد کو دینی تعلیم دینے کی فکر نہیں کرتے، اولاد کو نہ تو قرآنِ کریم صحیح طریقے سے پڑھنا آتا ہے، نہ ان کو نمازوں کا صحیح طریقہ آتا ہے اور نہ ہی ان کو دین کی بنیادی معلومات حاصل ہیں۔ دنیاوی تعلیم اعلیٰ درجے کی حاصل کرنے کے باوجود ان کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ فرض، سنت میں کیا فرق ہوتا ہے؟ لہٰذا اولاد کو دین سکھانے کا اتنا ہی اہتمام کرنا چاہیے جتنا خود نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھر جاکر گھر والوں کو حکم دو، یعنی ان کو دین کی باتوں کا اور فرائض پر عمل کرنے کا حکم دو۔

کس طرح نماز پڑھنی ہے

پھر فرمایا: "صَلُّوا كَمَا رَأَيتمونی أُصَلِّی" یعنی اپنے وطن جاکر اسی طرح نماز پڑھنا جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ آپ نے ان سے صرف یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھتے رہنا، بلکہ یہ فرمایا کہ نماز اس طرح پڑھنا جس طرح تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی یہ نماز دین کا ستون ہے، اس لیے اس کو ٹھیک اسی طرح بجالانے کی کوشش کرنی چاہیے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور منقول ہے۔ یہ سلسلہ بھی

ہمارے معاشرے میں بڑی توجہ کا طالب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت سے لوگ نماز پڑھتے تو ہیں، لیکن وہ پڑھنا ایسا ہوتا ہے جیسے سر سے ایک بوجھ اتار دیا، نہ اس کی فکر کہ قیام صحیح ہوا یا نہیں؟ رکوع صحیح ہوا یا نہیں؟ سجدہ صحیح ہوا یا نہیں اور یہ ارکان سنت کے مطابق ادا ہوئے یا نہیں؟ بس جلدی جلدی نماز پڑھ کر فارغ ہوگئے اور سر سے فریضہ اتار دیا۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ یہ فرمارہے ہیں کہ "صَلُّوا كَمَا رَأَيتموني أُصَلِّي" یعنی جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔

نماز سنت کے مطابق پڑھیے

دیکھیے! اگر نماز سنت کے مطابق اس طرح پڑھی جائے جس طرح نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ سے ثابت ہے تو اس میں کوئی زیادہ وقت خرچ نہیں ہوتا، نہ ہی زیادہ محنت لگتی ہے، بلکہ اتنا ہی وقت صرف ہوگا اور اتنی ہی محنت خرچ ہوگی جتنی کہ اس طریقے سے پڑھنے میں لگتی ہے جس طریقے سے ہم پڑھتے ہیں، لیکن اگر تھوڑا سا دھیان اور توجہ کرلی جائے کہ جو نماز میں پڑھ رہا ہوں وہ سنت کے مطابق ہوجائے، تو اس توجہ کے نتیجے میں وہی نماز سنت کے نور سے منور ہوجائے گی اور غفلت سے اپنے طریقے سے پڑھتے رہوگے تو فریضہ تو ادا ہوجائے گا اور نماز چھوڑنے کا گناہ بھی نہ ہوگا، لیکن سنت کا جو نور ہے جو اس کی برکت ہے اور اس کے جو فوائد ہیں وہ حاصل نہ ہوں گے۔ ایک مرتبہ میں نے اسی مجلس میں تفصیل سے یہ عرض کیا تھا کہ سنت کے مطابق کس طرح نماز پڑھی جاتی ہے، وہ بیان قلم بند ہوکر شائع ہوچکا ہے، جس کا نام "نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے"[1] ہے،

(۱) اس کے لیے مواعظِ عثمانی کے حصہ عبادات کی مراجعت مفید رہے گی۔ از مرتب

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اور عام طور پر لوگ نماز میں جو غلطیاں کرتے ہیں اس میں اس کی نشان دہی کردی ہے۔ آپ اس رسالے کو پڑھیں اور پھر اپنی نماز کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ جس طریقے سے آپ نماز پڑھتے ہیں، اس میں اور جو طریقہ اس رسالے میں لکھا ہے اس میں کیا فرق ہے؟ آپ اندازہ لگائیں گے کہ اس رسالے کے مطابق نماز پڑھنے میں کوئی زیادہ وقت خرچ نہیں ہوگا، زیادہ محنت نہیں لگے گی، لیکن سنت کا نور حاصل ہو جائے گا لہٰذا ہر مسلمان کو اس کی فکر کرنی چاہیے۔

حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا نماز کی درستی کا خیال

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تراسی (۸۳) سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ بچپن سے دین ہی پڑھنا شروع کیا، ساری عمر دین ہی کی تعلیم دی اور فتوے لکھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے مفتیٔ اعظم قرار پائے۔ پھر جب پاکستان تشریف لائے تو یہاں پر بھی "مفتیٔ اعظم" کے لقب سے مشہور ہوئے اور بلا مبالغہ لاکھوں فتووں کے جواب زبانی اور تحریری دیے اور ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزاری۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ میری ساری عمر فقہ پڑھنے پڑھانے میں گزری، لیکن اب بھی بعض اوقات نماز پڑھتے ہوئے ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں، چنانچہ نماز پڑھنے کے بعد کتاب دیکھ کر یہ پتا لگاتا ہوں کہ میری نماز درست ہوئی یا نہیں؟ لیکن میں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ کسی کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نماز درست ہوئی یا نہیں؟ بس پڑھ لی اور سنت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کا خیال تو بہت دور کی بات ہے۔

نماز فاسد ہو جائے گی

نماز کی صفوں میں روزانہ یہ منظر نظر آتا ہے کہ لوگ آرام سے بالکل بے پروا ہو کر نماز میں کھڑے ہوئے سر کھجا رہے ہیں یا دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر رہے ہیں۔ یاد رکھیے! اس طرح اگر دونوں ہاتھ سے کوئی کام لیا اور اس حالت میں اتنا وقت گزر گیا جتنی دیر میں تین مرتبہ ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کی تسبیح پڑھی جا سکے تو بس نماز ٹوٹ گئی، فاسد ہو گئی، فریضہ ہی ادا نہ ہوا، لیکن لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ بعض اوقات دونوں ہاتھوں سے کپڑے درست کر رہے ہیں یا دونوں ہاتھوں سے پسینہ صاف کر رہے ہیں، حالانکہ اس طرح کرنے میں زیادہ وقت لگ جائے تو نماز ہی فاسد ہو جاتی ہے۔

یاد رکھیے! نماز میں ایسی ہیئت اختیار کرنا جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ شاید یہ نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو ایسی ہیئت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص نماز میں ایک ہاتھ سے کام کرے اس کے بارے میں فقہائے کرام نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک رکن میں مسلسل تین مرتبہ ایک ہاتھ سے کوئی کام کرے کہ دیکھنے والا اسے نماز میں نہ سمجھے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ اسی طرح سجدہ کرتے وقت پیشانی تو زمین پر ٹکی ہوئی ہے لیکن دونوں پاؤں زمین سے اٹھے ہوئے ہیں، اگر پورے سجدے میں دونوں پاؤں پورے اٹھے رہے اور ذرا سی دیر کے لیے بھی زمین پر نہ ٹکے تو سجدہ ادا نہ ہوا اور جب سجدہ ادا نہ ہوا تو نماز بھی درست نہ ہوئی۔ (۱)

---

(۱) ملاحظہ ہو الفتاوی الهندیہ ۱۰۲/۱ الباب السابع فیما یفسد الصلاۃ/النوع الثانی فی الافعال المفسدۃ للصلاۃ طبع دار الکفر۔

صرف نیت کی درستی کافی نہیں

یہ چند باتیں مثال کے طور پر عرض کردیں۔ ان کی طرف توجہ اور دھیان نہیں اور ان کی اصلاح اور درستی کی فکر نہیں، بلکہ ان کی طرف سے غفلت ہے، وقت بھی خرچ کر رہے ہیں، نماز بھی پڑھ رہے ہیں، لیکن اس کو صحیح طریقے سے ادا کرنے کی فکر نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کری کرائی محنت اکارت جارہی ہے اور اب تو یہ حال ہے کہ اگر کسی کو بتایا جائے کہ بھائی! نماز میں ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے، تو ایک ٹکا سا جواب ہر شخص کو یاد ہے، بس وہ جواب دے دیا جاتا ہے، وہ یہ کہ "انما الاعمال بالنیات" یہ ایسا جواب ہے جو ہر جگہ جا کر فٹ ہوجاتا ہے۔ یعنی ہماری نیت تو درست ہے اور اللہ میاں نیت کو دیکھنے والے ہیں۔

ارے بھائی! اگر نیت ہی کافی تھی تو یہ سب تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی، بس گھر میں بیٹھ کر نیت کرلیتے کہ ہم اللہ میاں کی نماز پڑھ رہے ہیں، بس نماز ادا ہوجاتی۔ ارے بھائی! نیت کے مطابق عمل بھی تو چاہیے، مثلاً آپ نے یہ نیت تو کرلی کہ میں لاہور جارہا ہوں اور کوئٹہ والی گاڑی میں بیٹھ گئے تو کیا خالی یہ نیت کرنے سے کہ میں لاہور جارہا ہوں کیا تم لاہور پہنچ جاؤ گے؟ اسی طرح اگر نیت کرلی کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، لیکن نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا، تو تنہا نیت کرنے سے نماز کس طرح درست ہوگی؟ جب تک وہ طریقہ اختیار نہ کیا ہو جو جناب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ نے ان نوجوانوں کو رخصت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سنت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اذان کی اہمیت

پھر آپ نے ان سے فرمایا:

''فِاذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ فَلْیُؤَذِّنْ لَکُمْ أَحَدُکُم''

یعنی جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے۔

یہ اذان دینا مسنون ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص مسجد میں نماز نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ جنگل یا صحراء میں نماز پڑھ رہا ہے تو اس وقت بھی سنت یہ ہے کہ اذان دے۔ یہاں تک کہ اگر اکیلا ہے تب بھی حکم یہ ہے کہ اذان دے کر نماز پڑھے۔ کیوں کہ اذان اللہ کے دین کا ایک شعار اور علامت ہے، اس لیے ہر نماز کے وقت اذان کا حکم ہے۔ بعض علمائے کرام سے سوال کیا گیا کہ جنگل اور صحراء میں اذان دینے سے کیا فائدہ ہے؟ جب کہ کسی اور انسان کے سننے اور سن کر نماز کے لیے آنے کی کوئی امید نہیں یا مثلاً غیر مسلموں کا علاقہ ہے تو پھر اذان دینے سے کیا فائدہ؟ اس لیے کہ اذان کی آواز سن کر کون نماز کے لیے آئے گا؟ تو علمائے کرام نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بے شمار ہیں، ہوسکتا ہے کہ انسان اس اذان کی آواز کو نہ سنیں لیکن ہوسکتا ہے کہ جنات اذان کی آواز سن کر آجائیں یا ملائکہ آجائیں اور وہ تمہاری نماز میں شریک ہوجائیں۔ بہرحال! حکم یہ ہے کہ نماز سے پہلے اذان دو، چاہے تم تنہا ہی ہو۔

بڑے کو امام بنائیں

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ

"وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ"

یعنی تم میں سے جو شخص عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔

اصل حکم یہ ہے کہ اگر جماعت کے وقت بہت سے لوگ موجود ہیں تو ان میں جو شخص علم میں زیادہ ہو، اس کو امامت کے لیے آگے کرنا چاہیے، لیکن یہاں پر چونکہ علم کے اعتبار سے یہ حضرات برابر تھے، سب اکٹھے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے جو علم ایک نے سیکھا وہی علم دوسرے نے بھی سیکھا اور حکم یہ ہے کہ جب علم میں سب برابر ہوں تو پھر جو شخص عمر میں بڑا ہو اس کو آگے کرنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بڑے آدمی کا ایک اعزاز رکھا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے عمر میں بڑا بنایا ہے، چھوٹوں کو چاہیے کہ اس کو اپنا بڑا مانیں اور بڑا مان کر اس کو آگے کریں۔

بڑے کو بڑائی دینا اسلامی ادب ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے میں خیبر، جو یہودیوں کی بستی تھی، وہاں پر ایک مسلمان کو یہودیوں نے قتل کر دیا تھا، جن صاحب کو قتل کیا گیا تھا ان کے ایک بھائی تھے جو اس مقتول کے ولی تھے، وارث تھے، وہ بھائی اپنے چچا کو لے کر حضورِ اقدس ﷺ کے پاس یہ بتانے کے لیے آئے کہ ہمارا بھائی قتل کر دیا گیا، اب اس کا بدلہ لینے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ چونکہ یہ جو بھائی تھے یہ رشتہ کے اعتبار سے مقتول کے زیادہ قریبی تھے اور دوسرے چچا تھے۔ یہ دونوں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور مقتول کے بھائی نے حضورِ اقدس ﷺ سے بات کرنی شروع کر دی اور چچا خاموش بیٹھے تھے تو اس وقت حضورِ اقدس ﷺ نے مقتول کے بھائی سے فرمایا کہ

"کَبِّرِ الْکُبْرَ"(۱)

بڑے کو بڑائی دو۔

یعنی جب ایک بڑا تمہارے ساتھ موجود ہے تو پھر تمہیں گفتگو کا آغاز نہ کرنا چاہیے، بلکہ تمہیں اپنے چچا کو کہنا چاہیے کہ گفتگو کا آغاز وہ کریں، پھر جب ضرورت ہو تو تم بھی درمیان میں گفتگو کر لینا، لیکن بڑے کو بڑائی دو۔

یہ بھی اسلامی آداب کا ایک تقاضا ہے کہ جو عمر میں بڑا ہو اس کو آگے کیا جائے۔ اگرچہ اس کو دوسری کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، صرف بڑی عمر ہونے کی فضیلت حاصل ہے، تو اس کا بھی ادب اور لحاظ کیا جائے اور اس کو آگے رکھا جائے، نہ کہ چھوٹا آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اسی لیے آپ نے ان نوجوانوں سے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں جو عمر میں بڑا ہو اس کو امام بنادو۔ اس لیے کہ امامت کا منصب ایسے آدمی کو دینا چاہیے جو سب میں علم کے اعتبار سے فائق ہو یا کم از کم عمر کے اعتبار سے فائق ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) صحیح البخاری ۸/۳٤(٦١٤٢).

ہر خبر کی تحقیق کرنا ضروری ہے

(اصلاحی خطبات ج۱۶ ص۲۶۸)
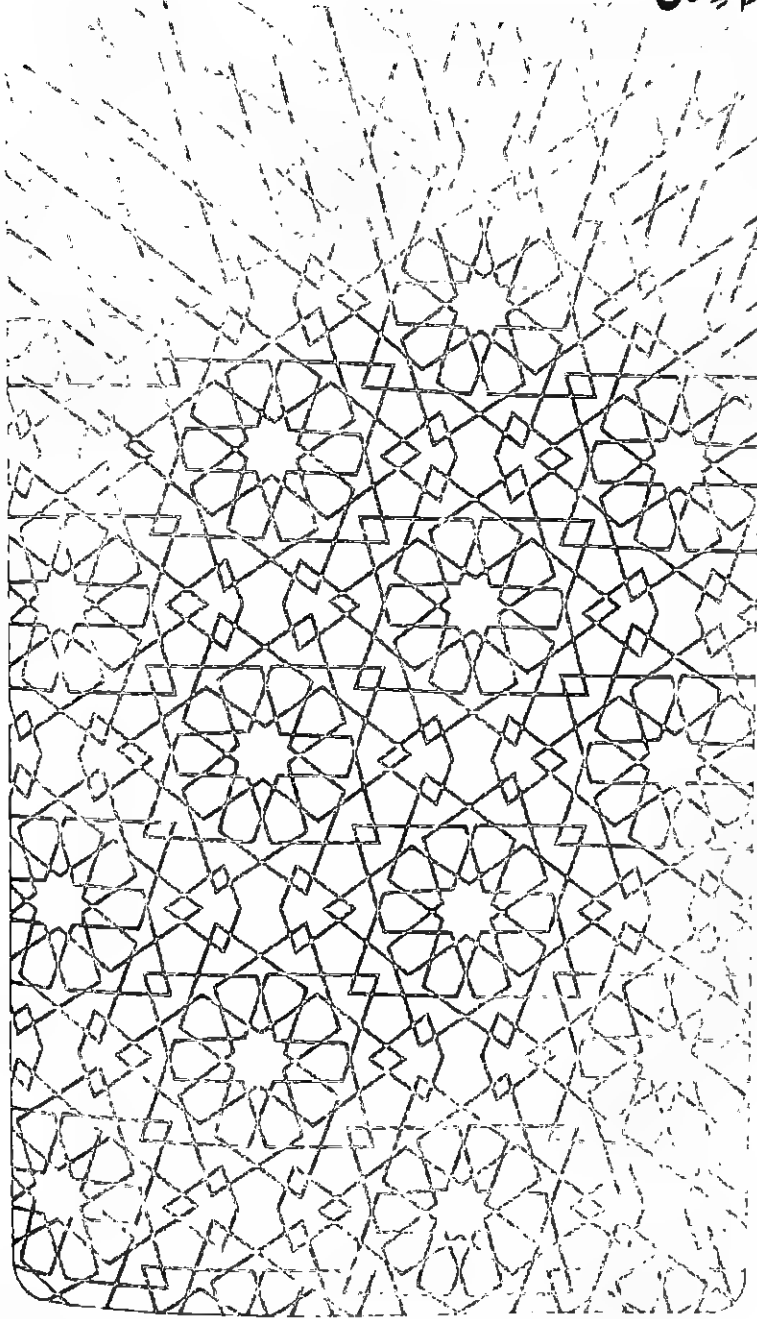
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر خبر کی تحقیق کرنا ضروری ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِينُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا،

أما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ

تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۞ [1]

تمہید و ترجمہ

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ''سورۃ الحجرات'' کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری معاشرتی زندگی سے متعلق بڑی اہم ہدایات عطا فرمائی ہیں، اسی سورت کی ایک آیت ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ

> اے ایمان والو! اگر کوئی گناہ گار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم ذرا ہوشیاری سے کام لو، (یعنی ہر شخص کی ہر بات پر اعتماد کر کے کوئی کارروائی نہ کرو، ہوشیاری سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق کرو کہ یہ خبر واقعی سچی ہے یا نہیں؟) اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ نادانی میں کچھ لوگوں کو تم نقصان پہنچا دو اور بعد میں تمہیں اپنے فعل پر ندامت اور شرمساری ہو (کہ ہم نے یہ کیا کر دیا)۔

یہ آیتِ کریمہ کا ترجمہ ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات پر بھروسہ کر کے کوئی کارروائی نہ کیا کرے، بلکہ جو خبر ملے جب تک اس خبر کی پوری تحقیق نہ ہو جائے اور جب تک

---

(۱) سورۃ الحجرات آیت (٦).

وہ خبر صحیح ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اس خبر کی بنیاد پر نہ کوئی بات کہنا جائز ہے اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی کارروائی کرنا جائز ہے۔

آیت کا شانِ نزول

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی تھی، جس کو اصطلاح میں ''شانِ نزول'' کہا جاتا ہے، واقعہ یہ تھا کہ عرب میں ایک قبیلہ ''بنو مصطلق'' کے نام سے آباد تھا، بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار جن کی بیٹی جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا امہات المؤمنین میں سے ہیں، وہ خود اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا، میں نے اسلام قبول کرلیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کرلیا اور میں نے عرض کیا کہ میں اپنی قوم میں واپس جا کر ان کو بھی اسلام کی اور اداءِ زکوٰۃ کی دعوت دوں گا، جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، ان کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا، آپ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد بھیج دیں تاکہ زکوٰۃ کی جو رقم میرے پاس جمع ہو جائے وہ ان کے سپرد کردوں۔

قاصد کے استقبال کے لیے بستی سے باہر نکلنا

حسبِ وعدہ جب حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی اور وہ مہینہ اور تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لیے طے ہوئی تھی گزر گئی اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ

وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے، حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا اور ارادہ کیا کہ یہ سب حضور اقدس سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قبیلہ ''بنو المصطلق'' کے لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ فلاں تاریخ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد آئے گا، اس لیے اس تاریخ کو یہ حضرات تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ قاصد کا استقبال کریں۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا واپس جانا

دوسری طرف یہ واقعہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیج دیا تھا، مگر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو راستے میں خیال آیا کہ اس قبیلے کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں، چونکہ وہ لوگ ان کے استقبال کے لیے بستی سے باہر بھی نکلے تھے، اس لیے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اور زیادہ یقین ہوگیا کہ یہ لوگ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں، چنانچہ آپ راستے ہی سے واپس ہوگئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہا کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اس لیے میں واپس چلا آیا۔

تحقیق کرنے پر حقیقت واضح ہوئی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر غصہ آیا اور آپ نے مجاہدین کا ایک لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا، ادھر سے مجاہدین کا لشکر روانہ

ہوا ادھر حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہوئے، جب آمنا سامنا ہوا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ لوگ ہمارے اوپر کیوں چڑھائی کرنے آئے ہو؟ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری بات یہ ہوئی تھی کہ تم میں سے کوئی شخص زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے آئے گا۔ لشکر والوں نے جواب دیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ایک شخص آیا تھا لیکن آپ لوگوں نے اس پر حملہ کرنے کے لیے لشکر اکٹھا کرلیا۔ بنو المصطلق کے لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کوئی آدمی نہیں آیا اور نہ ہم نے لشکر اکٹھا کیا، بلکہ ہم لوگ اس خیال میں تھے کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد آنے والا ہے، اس لیے ہم لوگ روزانہ استقبال کرنے کے ارادے سے باہر نکل کر جمع ہوجاتے تھے، تب حقیقت حال کھلی اور پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے واپس آکر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا واقعہ سنایا کہ یہ غلط فہمی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے یہ سارا قصہ ہوا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۱)

سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے اس کی تحقیق کرو، تحقیق کے بغیر اس خبر کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ کرو۔ اس واقعے میں ساری غلط فہمی جو پیدا ہوئی، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کسی نے آکر بتادیا

(۱) ملاحظہ ہو تفسیر طبری ۲۸۶/۲۲ و تفسیر ابن کثیر ۳۶۰/۷۔

ہوگا کہ یہ لوگ تم سے لڑنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس لیے وہ راستے ہی سے واپس آگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو یہ ہدایت دے دی کہ ایسا نہ ہو کہ جو بات کسی سے سن لی، بس اس پر یقین کرلیا اور اس بات کو آگے چلتا کردیا اور اس خبر کی بنیاد پر کوئی کاروائی شروع کردی، ایسا کرنا حرام ہے۔

افواہ پھیلانا حرام ہے

اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''افواہ سازی'' کہتے ہیں، یعنی افواہیں پھیلانا۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ برائی اس طرح پھیل گئی ہے کہ ''الامان والحفیظ'' کسی بات کو آگے نقل کرنے میں، بیان کرنے میں احتیاط اور تحقیق کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا، بس کوئی اڑتی ہوئی بات کان میں پڑگئی، اس کو فوراً آگے چلتا کردیا۔ خاص طور پر اگر کسی سے مخالفت ہو، کسی سے دشمنی ہو، کسی سے سیاسی یا مذہبی مخالفت ہو، یا ذاتی مخالفت ہو تو اگر اس کے بارے میں ذرا سی بھی کہیں سے کان میں کوئی بھنک پڑ جائے گی، تو اس پر یقین کرکے لوگوں کے اندر اس کو پھیلانا شروع کردیں گے۔

آج کل کی سیاست

آج کل سیاست کے میدان میں جو گندگی ہے، اس گندی سیاست میں یہ صورتِ حال ہورہی ہے کہ اگر سیاست میں ہمارا کوئی مدِ مقابل ہے تو اس کے بارے میں افواہ گھڑنا اور اس کو بغیر تحقیق کے آگے چلتا کردینا، اس کا آج کل عام رواج ہورہا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں شخص نے اتنے لاکھ روپے لے کر اپنا ضمیر بیچا

ہے، بغیر تحقیق کے الزام عائد کردیا، یاد رکھیے! کوئی شخص کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، لیکن اس پر جھوٹا الزام عائد کرنے کا کوئی جواز نہیں، شرعاً ایسا کرنا حرام ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت جائز نہیں

ایک مجلس میں حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف کی برائی شروع کردی۔ حجاج بن یوسف ایک ظالم حکمران کے طور پر مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے سینکڑوں بڑے بڑے علماء کو قتل کیا۔ کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف پر الزام عائد کیا کہ اس نے یہ کیا تھا، حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سوچ سمجھ کر بات کرو، یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم و جابر ہے تو اس کی غیبت کرنا حلال ہوگیا یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہوگیا، اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف سے سینکڑوں انسانوں کے خون کا بدلہ لے گا جو اس کی گردن پر ہیں تو تم سے بھی اس کا بدلہ لے گا جو تم نے اس کے بارے میں جھوٹی بات کہی۔ یہ مت سمجھنا کہ اگر وہ ظالم ہے تو جو چاہو اس کے بارے میں جھوٹ بولتے رہو، اس پر جو چاہو الزام تراشی کرتے رہو، تمہارے لیے یہ حلال نہیں۔(۱)

سنی ہوئی بات آگے پھیلانا جھوٹ میں داخل ہے

بہرحال! کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی بات بغیر تحقیق کے کہہ دینا یہ اتنی بڑی بیماری ہے جس سے پورے معاشرے میں بگاڑ اور فساد پھیلتا ہے،

(۱) الرسالة القشيرية ۲۹۱/۱ طبع دار المعارف القاهرة، وإحياء علوم الدين ۱۶۱۶/۹ طبع دار الشعب.

دشمنیاں جنم لیتی ہیں، عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی خبر ملے تو پہلے اس خبر کی تحقیق کرلو، ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

''کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ''(۱)

یعنی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کرنا شروع کردے۔ لہٰذا جو آدمی ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کرنے لگے تو وہ بھی جھوٹا ہے، اس کو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوگا۔ جب تک تحقیق نہ کرلو، بات کو آگے بیان نہ کرو۔

پہلے تحقیق کرو، پھر زبان سے نکالو

افسوس یہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ اس گناہ کے اندر ڈوبا ہوا ہے، ایک شخص کی بات آگے نقل کرنے میں کوئی احتیاط نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کر اضافہ کرکے اس کو آگے بڑھادیا۔ دوسرے شخص نے جب سنا تو اس نے اپنی طرف سے اور اضافہ کرکے آگے چلتا کردیا، بات ذرا سی تھی، مگر وہ پھیلتے پھیلتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اس کے نتیجے میں دشمنیاں، عداوتیں، لڑائیاں، قتل و غارت گری اور نفرتیں پھیل رہی ہیں۔ بہرحال! قرآنِ کریم ہمیں یہ سبق دے رہا ہے کہ یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے، یہ اس لیے نہیں دی کہ اس کے ذریعے تم جھوٹی افواہیں پھیلاؤ، اس لیے نہیں دی کہ اس کے ذریعے تم لوگوں پر الزام اور بہتان عائد کیا کرو، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ جب تک

(۱) صحیح مسلم: ۱۰/۱، باب النھی عن الحدیث بکل ماسمع.

کسی بات کی مکمل تحقیق نہ ہوجائے، اس کو زبان سے نہ نکالو۔ افسوس ہے کہ آج ہم لوگ باری تعالیٰ کے اس حکم کو فراموش کیے ہوئے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہم طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس برائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

افواہوں پر کان نہ دھریں

انسان کے کانوں میں مختلف اوقات میں مختلف باتیں پڑتی رہتی ہیں، کسی نے آکر کوئی خبر دے دی، کسی نے کوئی خبر سنادی، کسی نے کچھ کہہ دیا، اگر آدمی ہر ایک کی بات کو سچ سمجھ کر اس پر کارروائی کرنا شروع کردے تو سوائے فتنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ ایک اور موقع پر ایسا ہوا تھا کہ منافقین مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے، چنانچہ مسلمان سادہ لوحی میں ان کی باتوں کو سچ سمجھ کر کوئی کارروائی شروع کردیتے تھے، اس پر قرآنِ کریم کی ایک اور آیت نازل ہوئی، جس میں فرمایا کہ

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ (۱)

یعنی منافقین کا کام یہ ہے کہ ذرا سی کوئی افواہ کان میں پڑی، چاہے وہ حالتِ امن ہو یا حالتِ جنگ ہو، بس فوراً اس کی نشر و اشاعت شروع کردیتے ہیں اور اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کر اس کو روانہ کردیتے ہیں، جس

(۱) سورۃ النساء آیت (۸۳)۔

سے فتنہ پھیلتا ہے، مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب اس قسم کی کوئی خبر آپ تک پہنچے تو اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ کے رسول ﷺ کو اور دوسرے ذمہ دار افراد کو بتاؤ کہ یہ خبر پھیل رہی ہے، اس میں کون سی بات سچ ہے اور کون سی بات غلط ہے، اس کی تحقیق کریں اور تحقیق کے بعد کوئی فیصلہ کریں، نہ یہ کہ خود سے اس پر کارروائی شروع کردیں۔ یہ ایک عظیم ہدایت ہے جو قرآنِ کریم نے عطا فرمائی ہے۔

جس سے شکایت پہنچی ہو اس سے پوچھ لیں

افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس ہدایت کو نظر انداز کیا جارہا ہے، اس کے نتیجے میں فتنے پھیلے ہوئے ہیں، لڑائیاں ہیں، جھگڑے ہیں، عداوتیں ہیں، بغض اور کینہ ہے، ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی ہے، اگر غور کریں تو پتا چلے گا کہ ان سب کی بنیاد غلط افواہیں ہوتی ہیں، خاندان والوں میں یا ملنے جلنے والوں میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے بارے میں فلاں شخص یہ کہہ رہا تھا، اب آپ نے اس کی بات سن کر یقین کرلیا کہ اچھا! فلاں شخص نے میرے بارے میں یہ کہا ہے۔ اب اس کی بنیاد پر اس کی طرف سے دل میں دشمنی، بغض، کینہ پیدا ہوگیا کہ وہ تو میرے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، حالانکہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر کسی بھائی کی طرف سے شکایت کی کوئی بات پہنچی ہے تو براہِ راست اس سے جاکر پوچھ لے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں یہ بات فرمائی تھی، کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ اب صحیح بات کھل کر سامنے آجائے گی۔

باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ لوگ ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے میں بالکل احتیاط سے کام نہیں لیتے، اگر ذرا سی بات ہو تو اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس کے اندر اضافہ اور مبالغہ کر دیتے ہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں، ایک صاحب نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآنِ کریم کی تلاوت سننے سے ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا: "چونکہ قرآنِ کریم کے الفاظ پڑھے جارہے ہیں تو ان شاء اللہ، اللہ کی رحمت سے اس کو سننے سے بھی ثواب ملے گا، البتہ براہِ راست پڑھنے اور سننے سے زیادہ ثواب ملے گا"۔ اب اس شخص نے جا کر کسی اور کو بتایا ہوگا، دوسرے نے تیسرے کو بتایا ہوگا، تیسرے شخص نے چوتھے کو بتایا ہوگا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا اس میں لکھا تھا کہ یہاں ہمارے محلہ میں ایک صاحب تقریر میں یہ بات کہہ رہے ہیں کہ مولانا تقی عثمانی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ ٹیپ ریکارڈر پر تلاوت سننا ایسا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈر پر گانا سننا۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ بات کیا تھی اور ہوتے ہوتے کہاں تک پہنچی اور پھر برملا تقریر کے اندر یہ بات میری طرف منسوب کر دی کہ میں نے ایسا کہا ہے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے یہ بات کہی ہے!

تُلی ہوئی بات زبان سے نکلے

بہرحال! لوگوں میں بات نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، جب کہ

مسلمان کا کام یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلے وہ ترازو میں تلی ہوئی ہو، نہ ایک لفظ زیادہ ہو، نہ ایک لفظ کم ہو۔ خاص طور پر اگر آپ دوسرے کی کوئی بات نقل کر رہے ہوں تو اس میں تو اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس لیے کہ اگر آپ اس کے اندر اپنی طرف سے کوئی بات بڑھائیں گے تو دوسرے پر بہتان ہوگا، جس میں دوہرا گناہ ہے۔

حضراتِ محدثین رحمۃ اللہ علیہم کی احتیاط

قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب تم نے کسی شخص سے کوئی بات سنی ہو اور حالات ایسے ہیں کہ لوگ بات نقل کرنے میں احتیاط نہیں کر رہے ہیں تو ایسے حالات میں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ جو بات سنی اس کو آگے چلتا کر دیا۔ حضرات محدثین رحمۃ اللہ علیہم جنہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث محفوظ کر کے ہم تک پہنچائی ہیں، انہوں نے تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے کہ اگر ذرا سا بھی الفاظ میں فرق ہوجائے تو روایت نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ فرماتے تھے کہ اتنی بات ہمیں یاد ہے، اتنی بات ہمیں یاد نہیں۔ حالانکہ معنی ایک ہی ہیں، لیکن پھر بھی فرماتے کہ حضورِ اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ کہا تھا یا یہ لفظ کہا تھا۔

ایک محدث کا واقعہ

آپ نے سنا ہوگا کہ محدثین جب کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ”حَدَّثَنَا فُلَانٌ“ یعنی ہمیں فلاں نے یہ حدیث سنائی، ایک مرتبہ ایک

محدّث جب حدیث بیان کر رہے تھے تو ''حَدَّثَنَافلَانٌ'' کے بجائے ''ثَنا فلَانٌ'' کہہ رہے تھے، لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ ''ثَنا فلَانٌ'' کا کوئی مطلب اور معنی نہیں ہے، آپ ''حَدَّثَنَا فلَانٌ'' کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں جب استاد کے درس میں پہنچا تو اس وقت میں نے استاد کی زبان سے ''ثَنَا فلَانٌ'' کا لفظ سنا تھا، شروع کا لفظ ''حَدَّ'' میں نہیں سن سکا تھا، اس لیے میں ''ثَنَا فلَانٌ'' کے الفاظ سے حدیث سنا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ استاد نے ''حَدَّثَنَا'' ہی کہا تھا، صرف ''ثَنَا'' نہیں کہا تھا، لیکن چونکہ اپنے کانوں سے صرف ''ثَنَا'' سنا تھا، ''حَدَّ'' کا لفظ نہیں سنا تھا، اس لیے جب روایت کرتے تو ''حَدَّثَنَا'' نہیں کہتے، تاکہ جھوٹ نہ ہو جائے، بس جتنا سنا، اتنا ہی آگے بیان کروں گا، اس احتیاط کے ساتھ حضراتِ محدثین نے حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ احادیث ہم تک پہنچائی ہیں۔

حدیث کے بارے میں ہمارا حال

آج ہمارا یہ حال ہے کہ نہ صرف عام باتوں میں بلکہ حدیث کی روایت میں بھی احتیاط نہیں کرتے۔ حدیث کے الفاظ کچھ تھے، لیکن لوگ یہ کہہ کر بیان کر دیتے ہیں کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ فرمایا، حالانکہ اس حدیث کا کہیں سراغ نہیں ملتا اور تحقیق کے بغیر آگے بیان کر دیتے ہیں۔

حکومت پر بہتان لگانا

آج سیاسی پارٹیوں میں اور مذہبی فرقہ واریوں میں یہ بات عام ہوگئی ہے کہ ایک دوسرے پر بہتان لگانے میں کوئی باک اور ڈر محسوس نہیں کرتے، بس

ذراسی کوئی بات سنی اور آگے چلتی کردی۔ اگر حکومت سے ناراضگی ہے اور حکومت کے خلاف چونکہ طبیعت میں اشتعال ہے لہٰذا اس کے خلاف جو خبر آئے اس کو آگے پھیلادو، اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ یاد رکھیے! حکمرانوں کے اندر ہزاروں برائیاں موجود ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ان پر بہتان لگانا شروع کردو۔ افسوس یہ ہے کہ یہی معاملہ آج حکومت عوام کے ساتھ کررہی ہے، حکومت کے ایک بڑے ذمہ دار حکمران، جو پورے ملک کے ذمہ دار ہیں، ان کو لوگوں پر بہتان لگانے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتی۔

دینی مدارس کے خلاف دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈا

آج پروپیگنڈا ایک مستقل فن اور ہنر بن چکا ہے۔ جرمنی کا ایک سیاسی فلسفی گزرا ہے، اس نے یہ فلسفہ پیش کیا تھا کہ جھوٹ کو اتنی شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے، آج دنیا میں سارے پروپیگنڈے کا ہنر اس فلسفے کے گرد گھوم رہا ہے، جس پر جو چاہو بہتان لگاکر اس کے بارے میں پروپیگنڈا شروع کردو۔ آج دنیا میں یہ پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے کہ یہ دینی مدارس دہشت گرد ہیں اور ان میں طلبہ کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے، یہاں سے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ آج اس پروپیگنڈے کو تین سال ہوچکے ہیں اور عوام نہیں، بلکہ حکومت کے ذمہ دار لوگ برملا یہ کہتے ہیں کہ مدارس کے اندر دہشت گردی ہورہی ہے۔

مدارس کے حضرات نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ خدا کے لیے مدارس کے اندر آکر دیکھو تمہارے پاس ہتھیاروں کو پکڑنے کے حساس ترین آلات موجود ہیں اور دہشت گردی کی سراغ رسانی کے حساس ترین آلات موجود ہیں وہ سب

استعمال کرکے دیکھو کہ کسی مدرسے میں دہشت گردی کا سراغ ملتا ہے؟ اگر کسی مدرسے میں سراغ ملے تو ہماری طرف سے کھلی چھوٹ ہے کہ اس کے خلاف کارروائی کریں اور ہم بھی تمہارے ساتھ اس کے خلاف کارروائی کرنے میں تعاون کریں گے۔ مگر یہ رٹ لگی ہوئی ہے کہ یہ مدارس دہشت گرد ہیں اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر سارے دینی مدارس کو جہاں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے کلام کی تعلیم ہورہی ہے، ان کو دہشت گرد قرار دے دینا اور مغرب کے پروپیگنڈے کو آگے بڑھانا کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے؟

دینی مدارس کا معائنہ کرلو

تعلیمی اداروں میں بھی جرائم پیشہ لوگ گھس آتے ہیں۔ کیا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جرائم پیشہ لوگ نہیں ہوتے؟ ایسی صورت میں ان جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ ساری یونیورسٹیاں دہشت گرد ہیں اور سارے کالجز جرائم پیشہ ہیں، لیکن چونکہ مغرب کی طرف سے یہ پروپیگنڈا اس اصول کی بنیاد پر ہورہا ہے کہ جھوٹ اس شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ جاننے لگے! آج دینی مدارس اور دہشت گردی کو اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہوگئے۔ قرآنِ کریم کا کہنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت میں کسی قوم کو خواہ مخواہ نقصان پہنچادو پھر بعد میں تمہیں شرمندہ ہونا پڑے، اس لیے پہلے تحقیق کرلو، تحقیق کرنے کے تمام آلات اور وسائل تمہیں مہیا ہیں آکر دیکھ لو اور دینی مدارس پر الزام لگانے والے وہ ہیں جنہوں نے آج تک دینی مدارس کی شکل تک نہیں دیکھی، آکر دیکھا نہیں کہ وہاں

کیا ہورہا ہے؟ وہاں کیا پڑھایا جارہا ہے؟ کس طرح تعلیم دی جارہی ہے؟ لیکن مدارس کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے جو بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔

غلط مفروضے قائم کرکے بہتان لگانا

لندن والوں نے کہہ دیا کہ یہاں جو دھماکے ہوئے ہیں ان میں ایسا شخص ملوث ہے جس نے یہاں کے مدارس میں کچھ دن قیام کیا تھا۔ ارے بھائی! وہ شخص وہیں پلا بڑھا اور وہیں پر برطانیہ میں کسی دینی مدرسے میں نہیں، بلکہ برطانیہ کے ماڈرن تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی، اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ چند روز کے لیے پاکستان آیا تھا، تو کیا پاکستان آنے سے یہ لازم ہوگیا کہ اس نے ضرور دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہوگی اور اس نے یہاں ضرور دہشت گردی کی تربیت پائی ہوگی؟ اس بنیاد پر یہ مفروضے قائم ہوگئے اور اس بنیاد پر یہ نادر شاہی حکم نافذ ہوگیا کہ جتنے غیر ملکی طلبہ دینی مدارس میں پڑھتے ہیں ان کو ملک سے رخصت کردیا جائے۔

پہلے خبر کی تحقیق کرلو

میرے بھائیو! یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ عوام ہو یا حکومت، سیاسی جماعتیں ہوں یا مذہبی، سب اس میں مبتلا ہیں کہ ذرا افواہ اڑی کوئی بات کان میں پڑی، اس پر نہ صرف یہ کہ یقین کرلیا بلکہ اس کو آگے پھیلایا اور اس کی بنیاد پر کارروائی شروع کردی اور اس کے نتیجے میں ظلم وستم کی انتہا کردی گئی۔ جبکہ قرآنِ کریم نے اس آیت میں یہ پیغام دیا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار شخص کوئی خبر لے کر آتا ہے تو پہلے اس کی

تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچادو، بعد میں تم لوگوں کو ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اگر ہم قرآنِ کریم کے اس حکم کو پلے باندھ لیں اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کو استعمال کریں تو یقیناً ہمارے معاشرے کے نوے فی صد جھگڑے ختم ہوجائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں قرآن کریم کی اس ہدایت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔
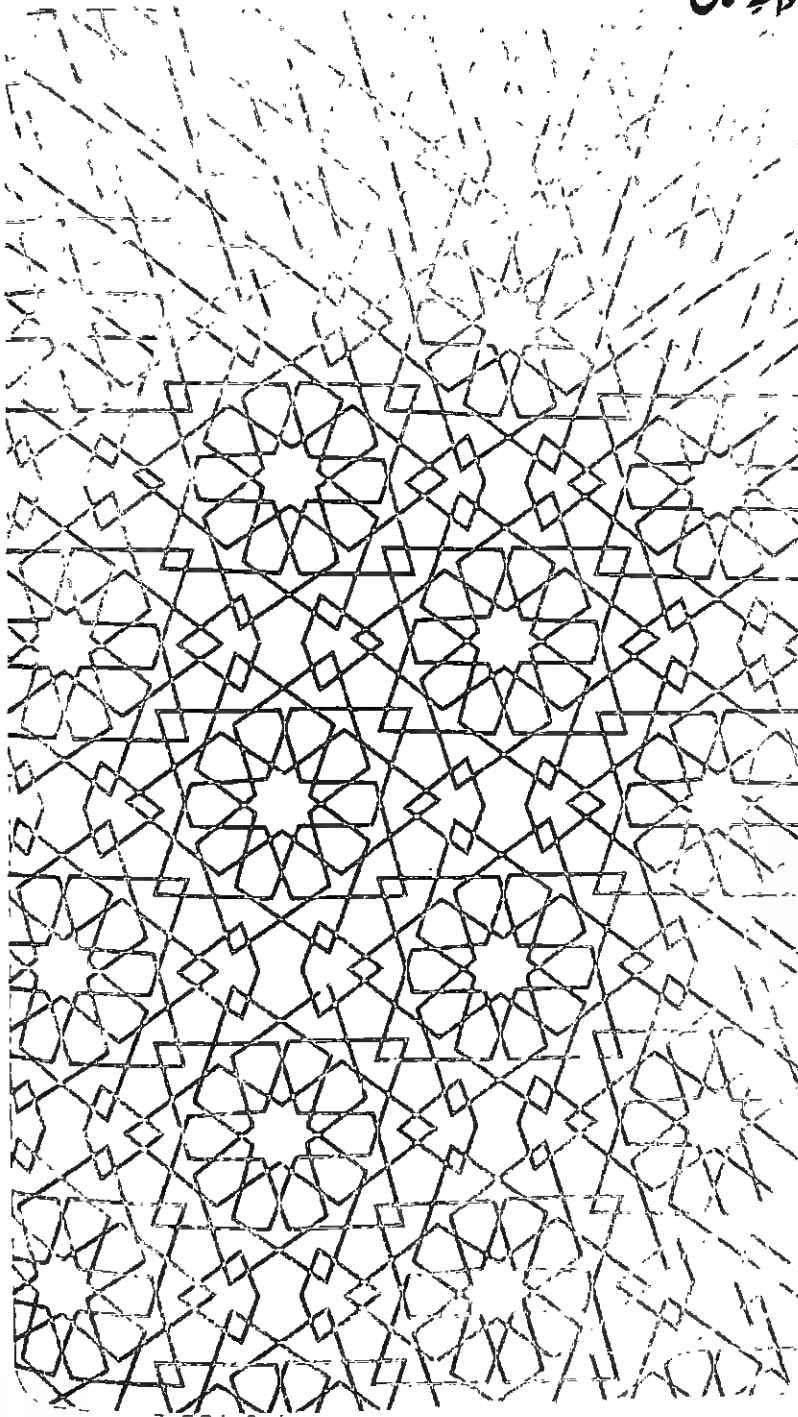
وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

لوگ کہتے ہیں

(ذکر و فکر ص ۲۱۳)
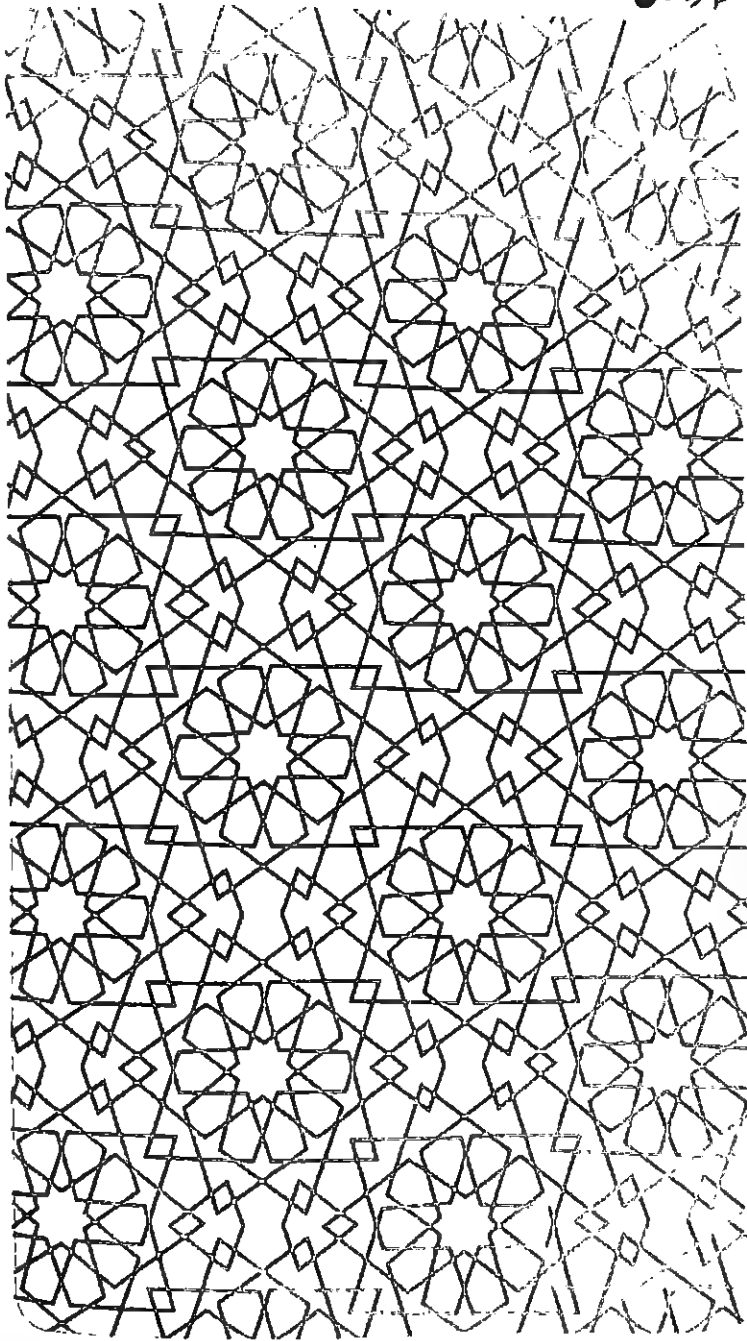
بسم اللہ الرحمن الرحیم

لوگ کہتے ہیں

انسانی نفس کی چوریوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون باخبر ہوسکتا ہے؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بھی دیا، اس کے تمام مضمرات کو سمجھتے ہوئے ایسے تمام راستوں کو بھی بند کیا جو اس حکم کی خلاف ورزی کی طرف لے جاسکتے ہیں اور ان چور دروازوں کی بھی نشان دہی فرمائی جہاں سے انسان کی نفسانی خواہشات حیلے بہانے تلاش کرسکتی ہیں۔ نفسِ انسانی کی ایک فطرت یہ ہے کہ جس برائی کا الزام وہ براہِ راست اپنے سر لینا نہیں چاہتا، اسے کسی اور شخص کے کندھے پر رکھ کر انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ مقصد بھی حاصل ہوجائے اور اپنے اوپر حرف بھی نہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کے سلسلے میں انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو نہایت لطیف اور بلیغ پیرائے میں بیان فرمایا ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''بِئْسَ مَطِيَّةُ الْكَذِبِ زَعَمُوْا''[1]

---

(۱) سنن ابی داود ۲۹٤/٤ (٤۹۷۲) و مسند احمد ۳۰۷/۲۸ (۱۷۰۷۵) بلفظ ''بئس مطية الرجل زعموا''، وذكره الحافظ ابن حجر فی ''فتح الباری'' ۵۵۱/۱۰ وقال أخرجه أحمد وأبو داود ورجاله ثقات إلا أن فيه انقطاعاً.

جھوٹ کی بدترین سواری یہ فقرہ ہے کہ ''لوگ یوں کہتے ہیں''۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ براہِ راست جھوٹ بولنے سے کتراتے ہیں، وہ بے بنیاد اور بے تحقیق باتیں لوگوں کے سر پر رکھ کر کہہ دیتے ہیں، ''لوگ تو یوں کہتے ہیں''، ''لوگوں میں تو یہ بات مشہور ہے''، ''لوگوں کا کہنا تو یہ ہے'' یہ وہ فقرے ہیں، جو جھوٹ کے الزام سے بچنے کے لیے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور جھوٹ جو اپنے پاؤں چل کر نہیں پھیل سکتا، اس قسم کے فقروں پر سوار ہو کر پھیل جاتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے اس فقرے کو ''جھوٹ کی سواری'' قرار دیا۔

یہ تو ایک لطیف اور استعاراتی پیرایۂ بیان تھا، جو حقائق پر نگاہ رکھنے والوں کے لیے بڑا مؤثر اور دل میں اتر جانے والا ہے، لیکن اسی بات کو آپ ﷺ نے ایک اور حدیث میں بالکل سادہ اور عام فہم الفاظ میں بھی ارشاد فرمایا جسے ہر شخص سنتے ہی سمجھ جائے، فرمایا:

''كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ''(۱)
انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات بھی کافی ہے کہ وہ ہر وہ بات دوسروں کو سنانے لگے جو اس نے کہیں سے بھی سن لی ہو۔

دونوں ارشادات کا منشا درحقیقت یہ بتانا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہر کچی پکی بات کہیں سے سن کر اسے آگے چلادے، اس

(۱) صحیح مسلم ۱/۱۰ باب النہی عن الحدیث بکل ما سمع۔

طرح افواہیں جنم لیتی ہیں، جھوٹی باتیں معاشرے میں پھیلتی ہیں اور متضاد افواہوں کے گردوغبار میں حقیقت کا چہرہ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی ایسی بے تحقیق افواہیں پھیلانے کی پرزور مذمت کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں یہ منافقین کا وطیرہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان ایسی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے جن سے لوگوں میں بے چینی اور تشویش پیدا ہوتی تھی اور دشمنوں کو فائدہ پہنچتا تھا، قرآن کریم نے ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۚ (۱)

جب بھی امن یا خوف (جنگ) کے بارے میں انہیں کوئی بات پہنچتی ہے، وہ اسے پھیلانے میں لگ جاتے ہیں، اگر وہ اسے (پھیلانے کے بجائے) پیغمبر تک اور ذمہ دار لوگوں تک پہنچاتے تو ایسے لوگ اس کی حقیقت جان لیتے جو اس کی کھود کرید (تحقیق) کرسکتے ہیں۔

قرآن وسنت کے ان ارشادات سے اسلام کا جو مجموعی مزاج سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک کسی بات کی مناسب تحقیق نہ ہوجائے، اس وقت تک اُسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا جائز نہیں، اگر کوئی شخص اس قسم کی بلاتحقیق بات کو پورے وثوق اور یقین سے بیان کرے تب تو ظاہر ہے کہ وہ خلافِ واقعہ اور غلط بیانی کے ذیل میں آتا ہے، لیکن اگر بالفرض وثوق کے ساتھ

(۱) سورۃ النساء آیت (۸۳).

بیان کرنے کے بجائے ''لوگ کہتے ہیں'' جیسے فقرے کا پردہ رکھ کر بیان کرے، لیکن مقصد یہی ہے کہ سننے والے اُسے سچ باور کرلیں، تب بھی مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں ایسا کرنا جائز نہیں۔

دراصل اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بن کر زندگی گزارے، اس کے منہ سے جو بات نکلے، وہ کھری اور سچی بات ہو اور وہ اپنے کسی قول وفعل سے غیر ذمہ داری کا ثبوت نہ دے، قرآنِ کریم ہی کا ارشاد ہے کہ:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۱)

انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے، ہروقت (لکھنے کے لیے) تیار۔

مطلب یہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھے کہ جو بات وہ زبان سے نکال رہا ہے، وہ فضا میں تحلیل ہوکر فنا ہوجاتی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کہیں ریکارڈ ہورہی ہے اور آخرت میں اس سارے ریکارڈ کا ہر شخص کو جواب دینا ہوگا، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث میں زبان کو قابو میں رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ (۲)

لیکن ان تمام تعلیمات کے برعکس آج کل ہماری زبانیں اتنی بے قابو ہوگئی ہیں کہ ان کے استعمال میں ذمہ داری کا تصور ہی باقی نہیں رہا، جو کوئی اڑتی ہوئی

---

(۱) سورۃ ق آیت (۱۸)۔

(۲) وفی الحدیث "املك علیك لسانك" سنن ابی داود ۱۲٤/٤ (٤٣٤٣) وسنن الترمذی ۲۰۸/٤ (۲٤۰٦) وقال ھذا حدیث حسن۔

بات کہیں سے ہاتھ آگئی اسے تحقیق کے بغیر دوسروں تک پھیلانے اور پہنچانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی جاتی اور لوگ اسے بے دھڑک ایک دوسرے سے اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں، کہ فضا میں افواہوں کا ایک طوفان ہمہ وقت بپا رہتا ہے۔

یوں تو ہر قسم کی خبر میں احتیاط اور ذمہ داری کی ضرورت ہے، لیکن جس چیز کے نتیجے میں کسی دوسرے پر کوئی الزام لگتا ہو، اس میں تو احتیاط کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، کیونکہ اس سے کسی دوسرے انسان کی عزت وآبرو کا مسئلہ وابستہ ہے اور بلاتحقیق افواہوں کی بنیاد پر کسی انسان کی عزت کو مجروح کرنا صرف جھوٹ ہی نہیں، بہتان بھی ہے اور حقوق العباد میں سے ہونے کی بنا پر زیادہ سنگین جرم ہے، لیکن ہمارے موجودہ ماحول میں کسی شخص پر کوئی الزام عائد کرنا ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، جس میں کسی تحقیق اور ذمہ داری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، بالخصوص اگر کسی شخص سے ذاتی، جماعتی یا سیاسی اختلاف ہو تو اس کی غیبت کرنا، اس پر بہتان باندھنا اور اسے طرح طرح سے بے آبرو کرنا حلال طیب سمجھ لیا گیا ہے۔

اس صورتِ حال کے یہ نتائج بدکھلی آنکھوں ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ فضا جھوٹی خبروں سے اتنی آلودہ ہوچکی ہے کہ حقیقتِ حال کا پتا لگانا دشوار ہے اور اس کی وجہ سے کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہا، نیز جھوٹ کی اس قدر کثرت نے غلط بیانی اور بہتان طرازی کی برائی دلوں سے نکال دی ہے اور ہر غیر ذمہ دار شخص کو یہ حوصلہ ہوگیا ہے کہ وہ بے بنیاد سے بے بنیاد بات دھڑلے سے معاشرے میں

پھیلادے اور پھر ایک انتہائی خطرناک بات یہ ہے کہ غلط الزامات کے سیلاب میں حقیقی مجرموں کو بھی فی الجملہ پناہ مل گئی ہے، یعنی جو لوگ واقعی خطا کار اور بدعنوان ہیں، انہیں بدنامی کا زیادہ خطرہ باقی نہیں رہا، اس لیے کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر کوئی خبر ہماری بدعنوانی کے بارے میں اڑی تو وہ اسی طرح مشکوک سمجھی جائے گی، جیسے اور بہت سی بے تحقیق باتوں کو سنجیدہ لوگ مشکوک سمجھ کر نظر انداز کردیتے ہیں، چنانچہ بدعنوان افراد آرام سے بدعنوانیوں میں ملوث رہتے ہیں اور بہت سے بے گناہوں کے دامن پر داغ لگ جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ماحول میں غیر ذمہ دارانہ باتیں بے حد پھیل گئی ہیں، لیکن اس کا علاج بھی دور دور سے اس صورتِ حال کی مذمت کرتے رہنا نہیں ہے، بلکہ ہر برائی کا علاج یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ یہ عزم کرلے کہ دوسرے لوگ خواہ کچھ کرتے رہیں، کم از کم وہ اپنے قول وفعل میں ذمہ درای کا مظاہرہ کرے گا اور بے تحقیق باتوں کو پھیلا کر افواہ طرازی کا مرتکب نہیں ہوگا۔ ہر شخص کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی لا کر معاشرے سے کم از کم ایک غیر ذمہ دار شخص ضرور کم کرسکتا ہے اور اس کے نتیجے میں کم از کم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھوٹ کے گناہ سے بچا سکتا ہے اور پھر تجربہ یہ ہے کہ جب افراد میں فکر پیدا ہوتی ہے تو ایک شخص کا طرزِ عمل دوسرے کے لیے بھی ایک نمونہ بنتا ہے اور ایسے نمونوں میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جائے تو اسی طرح معاشرہ سدھار کی طرف رواں دواں ہوجاتا ہے۔ آج ہماری ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم معاشرتی برائیوں کے رواج عام کو مایوسی کا ذریعہ بنانے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں اور اپنے عمل

اور عزم سے بدعنوانی کی تاریکیوں میں امید کی مشعلیں روشن کریں، جن سے باعزت اور پاکیزہ زندگی کی طرف بڑھنے کا حوصلہ ابھرے، اس کے بغیر کبھی کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتی۔

۱۴/ صفر ۱۴۱۵ھ
۲۴/ جولائی ۱۹۹۴ء

غلط نسبت سے بچیے

(اصلاحی خطبات ۱۰/۲۴۹)
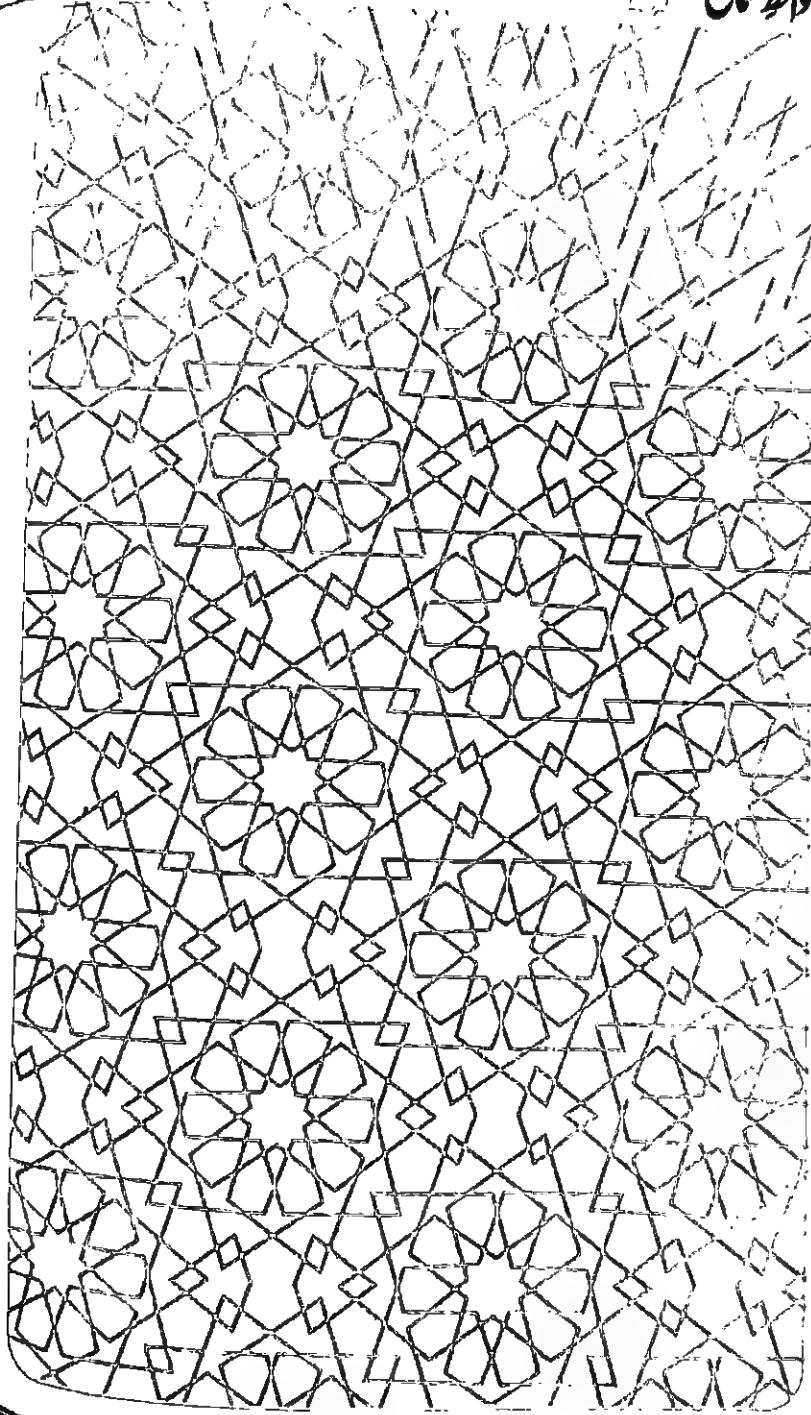
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلط نسبت سے بچیے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِينُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا،

أما بعد!

"عن جابر بن عبد الله رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: "من تحلّٰی بما لم يعطه كان كلابس ثوبي زور"[1]

(۱) سنن الترمذی ۳/۵۵٦ (۲۰۳٤) وقال هذا حديث حسن غريب۔

حدیث کا مطلب

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص آراستہ ہو ایسی چیز سے جو اس کو نہیں دی گئی تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے بارے میں لوگوں کے سامنے کوئی ایسی صفت ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر موجود نہیں، تو گویا اس نے اپنے پورے جسم پر سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ لپیٹ رکھا ہے اور جس طرح لباس نے سارے جسم کو ڈھانپا ہوا ہے، اس طرح اس نے جھوٹ سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا ہے۔

یہ بھی جھوٹ اور دھوکا ہے

مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ آدمی دھوکا دینے کے لیے اپنے لیے کوئی ایسی نسبت ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہے، مثلاً ایک شخص عالم نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتا ہے یا ایک شخص ایک خاص منصب نہیں رکھتا، لیکن اپنے آپ کو اس خاص منصب کا حامل ظاہر کرتا ہے۔ یا ایک شخص خاص حسب نسب سے تعلق نہیں رکھتا، مگر اپنے آپ کو اس نسب کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ جھوٹ کے کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔ اسی طرح ایک شخص مال دار نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو مال دار ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال! جو صفت انسان کے اندر موجود نہیں ہے، لیکن وہ بناوٹی طور پر اس صفت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس حدیث میں اس پر یہ وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

اپنے نام کے ساتھ ''فاروقی''، ''صدیقی'' لکھنا

مثلاً! ہمارے معاشرے میں اس میں بہت ابتلاء پایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو کسی ایسے نسب اور خاندان سے منسوب کر دیتے ہیں جس کے ساتھ حقیقت میں تعلق نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی شخص ''صدیقی'' نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ ''صدیقی'' لکھتا ہے، یا کوئی شخص ''فاروقی'' نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو ''فاروقی'' لکھتا ہے۔ یا کوئی شخص ''انصاری'' نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو ''انصاری'' لکھتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو کسی اور نسبت کی طرف منسوب کرنا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بڑا سخت گناہ ہے۔ اس کے بارے میں اس حدیث میں فرمایا کہ گویا اس نے سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ کا لباس پہنا ہوا ہے۔

کپڑوں سے تشبیہ کیوں؟

اس گناہ کو جھوٹ کے کپڑے پہننے والے سے اس لیے تشبیہ دی کہ ایک گناہ تو وہ ہوتا ہے جس میں انسان تھوڑی دیر کے لیے مبتلا ہوا، پھر وہ گناہ ختم ہوگیا، لیکن جس شخص نے غلط نسبت اختیار کر رکھی ہے اور لوگوں میں اپنی ایسی حیثیت ظاہر کر رکھی ہے جو حقیقت میں اس کی حیثیت نہیں ہے تو وہ ایک دائمی گناہ ہے اور ہر وقت اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ جس طرح لباس انسان کے ساتھ ہر وقت چپکا رہتا ہے، اسی طریقے سے یہ گناہ بھی ہر وقت انسان کے ساتھ چپکا رہے گا۔

جولاہوں کا ''انصاری'' اور قصائیوں کا ''قریشی'' لکھنا

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر

یعنی اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ مرد حضرت آدم اور عورت حضرت حوا علیہا السلام۔ اس لیے جتنے بھی انسان دنیا میں آئے ہیں سب ایک ماں باپ کے بیٹے ہیں۔ البتہ ہم نے یہ جو مختلف قبیلے بنادیے کہ کسی انسان کا تعلق کسی قبیلے سے ہے اور کسی انسان کا تعلق کسی خاندان سے ہے، یہ خاندان اور قبیلے اس لیے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اگر سب انسان ایک ہی قبیلے کے ہوتے تو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دشواری ہوتی، اب یہ بتا دینا آسان ہے کہ یہ فلاں شخص ہے اور فلاں قبیلے کا ہے، لہٰذا صرف پہچان کی آسانی کی خاطر ہم نے تمہیں قبیلوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن کسی قبیلے کو دوسرے قبیلے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ تم میں سب سے زیادہ بلند مرتبے والا اور عزت والا وہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسے نسب اور خاندان سے وابستہ ہے جس کو لوگ اعلیٰ نسب نہیں سمجھتے تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، تم اپنے اعمال اور اخلاق صحیح کرو اور اپنی زندگی کا کردار درست کرو تو پھر کردار اور عمل کے نتیجے میں تم اعلیٰ سے اعلیٰ نسب والے سے آگے بڑھ جاؤ گے۔ لہٰذا کیوں اپنے آپ کو غلط خاندان کی طرف منسوب کر کے گناہ کا ارتکاب کرتے ہو؟ اس لیے جس شخص کا جو نسب ہے وہ اسی کو بیان کرے اور نسب بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بیان ہی نہ کرے، لیکن اگر بیان کرنا ہی ہے تو نسب بیان کرے جو اپنا واقعی نسب ہے، بلاوجہ دوسرے نسب کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا جائز نہیں، اس پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

"مُتَبنّٰی" کو حقیقی باپ کی طرف منسوب کریں

اسی طرح کا ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جس پر قرآنِ کریم نے آدھا رکوع نازل کیا ہے: وہ یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص دوسرے کے بچے کو اپنا "متبنّٰی" "لے پالک" بنالیتا ہے، مثلاً کسی شخص کی کوئی اولاد نہیں ہے، اس نے دوسرے کا بچہ گود لے لیا اور اس کی پرورش کی اور اس کو اپنا "متبنّٰی" بنالیا، تو شرعاً "متبنّٰی" بنانا اور کسی بچے کی پرورش کرنا اور اپنے بیٹے کی طرح اس کو پالنا تو جائز ہے، لیکن شرعی اعتبار سے وہ "متبنّٰی" کسی بھی حالت میں اس پالنے والے کا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا۔ لہٰذا جب اس بچے کو منسوب کرنا ہو تو اس کو اصل باپ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے کہ فلاں کا بیٹا ہے، پرورش کرنے والے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں اور رشتے کے جتنے احکام ہیں وہ سب اصل باپ کی طرف منسوب ہوں گے، یہاں تک کہ جس شخص نے اس کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہے اور جو عورت منہ بولی ماں بنی ہے، اگر وہ نامحرم ہے تو اس بچے کے بڑے ہونے کے بعد اس سے اسی طرح پردہ کرنا ہوگا جس طرح ایک نامحرم سے پردہ ہوتا ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا "متبنّٰی" بنایا تھا۔ ان کا واقعہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان پر کسی نے حملہ کیا، یہ اس وقت اپنی ماں کے ساتھ اپنے اقرباء سے ملنے جارہے تھے، چنانچہ حملے کے نتیجے میں انہوں نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور پھر عکاظ کے بازار

میں اسے فروخت کے لیے لے آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام نے انہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے خریدا، اور جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہوئی تو انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کو ہبہ کیا[1]۔ وہ آپ ﷺ کے پاس خادم کی حیثیت سے رہنے لگے، ان کے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے افراد ان کی تلاش میں تھے کہ کہاں ہیں، تلاش کرتے کرتے کئی سال گزر گئے، کئی سال کے بعد کسی نے ان کو خبر دی کہ حضرت زید بن حارثہ مکہ مکرمہ میں ہیں اور وہ حضورِ اقدس ﷺ کے پاس رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے والد اور چچا تلاش کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور جا کر حضورِ اقدس سرور دو عالم ﷺ سے ملاقات کی اور کہا کہ یہ زید بن حارثہ جو آپ کے پاس رہتا ہے، یہ ہمارا بیٹا ہے، ہم اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں، یہ ہمیں نہیں مل رہا تھا، اب یہاں ہمیں مل گیا ہے، ہم اس کو لے جانا چاہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ٹھیک ہے تم اس کے باپ ہو اور وہ تمہارا بیٹا ہے، جا کر اس سے پوچھ لو، وہ اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے تو چلا جائے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، حضور ﷺ کی یہ بات سن کر خوش ہو گئے کہ چلو انہوں نے بہت آسانی سے اجازت دے دی، اب یہ دونوں باپ اور چچا اس خیال میں تھے کہ بیٹے کو جدا ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، باپ اور چچا کو دیکھ کر خوش ہو جائے گا اور ساتھ چلنے کے لیے فوراً تیار ہو جائے گا۔ اس وقت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حرم میں تھے۔ جب یہ دونوں ان کو لینے کے لیے وہاں پہنچے اور ملاقات کی تو انہوں نے فی الجملہ خوشی کا اظہار تو کیا، لیکن جب باپ نے یہ کہا کہ اب میرے ساتھ گھر چلو، تو انہوں نے کہا: ابا جان میں آپ کے

---

(1) الإصابة لابن حجر ٢/٤٩٥ طبع دار الكتب العلمية.

ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمادیا ہے اور آپ کو ابھی تک اسلام کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ یہاں پر مجھے جناب رسول اللہ ﷺ کی صحبت نصیب ہے، اس صحبت کو چھوڑ کر میں نہیں جاسکتا۔ باپ نے ان سے کہا کہ بیٹا تم اتنے عرصے کے بعد مجھ سے ملے، اس کے باوجود تم نے مجھے اتنا مختصر سا جواب دے دیا کہ تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے جو حقوق ہیں، میں ان کو ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن محمد (رسول اللہ ﷺ) سے میرا جو تعلق قائم ہوا ہے وہ اب مرنے جینے کا تعلق ہے، اس لیے میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

جب حضورِ اقدس ﷺ نے ان کا یہ جواب سنا تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ تم نے میرے ساتھ یہ تعلق قائم کیا ہے اس لیے میں تمہیں آج سے اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ اس طرح حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا متبنیٰ بنالیا۔ اس کے بعد سے حضورِ اقدس ﷺ ان کے ساتھ بیٹے جیسا ہی سلوک فرماتے، تو لوگوں نے بھی ان کو زید بن محمد (ﷺ) کہہ کر پکارنا شروع کردیا، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ آیت نازل ہوئی کہ

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ (۱)

یعنی تم لوگوں نے متبنیٰ کا جو نسب بیان کرنا شروع کردیا ہے، یہ درست نہیں، بلکہ جو بیٹا جس باپ کا ہے اس کو اسی حقیقی باپ کی طرف منسوب کرو، کسی اور کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اور دوسری جگہ یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (۵)۔

وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" (۱)

یعنی محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے حقیقی باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، اس لیے ان کی طرف کسی بیٹے کو منسوب مت کرو اور آئندہ کے لیے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ کوئی متبنیٰ آئندہ اپنے منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوگا، بلکہ حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوگا۔ (۲)

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ ایک اور صحابی حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے، ان کو بھی متبنیٰ بنایا گیا تھا۔ ان کے بارے میں بھی حضور اقدس ﷺ نے حکم فرمایا کہ یہ منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوں گے اور جب یہ اپنے منہ بولے باپ کے گھر میں داخل ہوں تو پردے کے ساتھ داخل ہوں۔ (۳) یہ سب احکام اس لیے دیے گئے کہ شریعت نے نسب کے تحفظ کا بہت اہتمام فرمایا ہے کہ کسی کی نسبت غلط نہ ہوجائے، اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا نہ ہوجائے۔ اس لیے جو شخص اپنا نسب غلط بیان کرے وہ اس حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے اور وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

اپنے نام کے ساتھ ''مولانا'' لکھنا

اسی طرح اگر کوئی شخص علم کا حامل نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً آج کل لوگ اپنے نام کے ساتھ ''مولانا'' لکھ دیتے ہیں، حالانکہ

---

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (٤٠)۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں تفسیر طبری ج ۲۰ ص ۲۰۶ تا ۲۰۸۔

(۳) معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم ۱۳۶۱/۳ طبع دار الوطن الریاض، والطبقات الکبری لابن سعد ۸٦/۳ طبع دار صادر بیروت۔

عرف عام میں لفظ ''مولانا'' یا لفظ ''علامہ'' ان افراد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو باقاعدہ دین کے حامل ہوں، اب اگر ایک شخص دین کا حامل نہیں ہے، وہ اگر ان الفاظ کو استعمال کرے گا تو اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا ہوگا اور وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہوگا۔

اپنے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' لکھنا

اسی طرح لفظ ''پروفیسر'' ہے۔ ہمارے معاشرے میں ''پروفیسر'' ایک خاص منصب ہے، اس کی خاص شرائط ہیں۔ ان شرائط کو جو شخص پوری کرے گا تو وہ پروفیسر کہلائے گا، لیکن آج کل یہ حال ہے کہ جو شخص کسی جگہ کا استاد بن گیا وہ اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھ دیتا ہے، حالانکہ اس کے ذریعے وہ اپنی ایک ایسی صفت ظاہر کر رہا ہے جو اس کے اندر موجود نہیں۔ اس لیے یہ غلط بیانی ہے اور دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنا ہے اور یہ بھی اس حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے اور حرام ہے اور ناجائز ہے۔

لفظ ''ڈاکٹر'' لکھنا

اسی طرح ایک شخص ''ڈاکٹر'' نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ لفظ ''ڈاکٹر'' لکھ دیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہوں نے چند دن تک کسی ڈاکٹر کے پاس کمپاؤنڈری کی، اس کے نتیجے میں کچھ دواؤں کے نام یاد ہوگئے، تو بس اس کے بعد اپنے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' لکھنا شروع کردیا اور پھر باقاعدہ کلینک کھول کر بیٹھ گئے اور علاج شروع کردیا۔ یہ بھی اس وعید کے اندر داخل ہے اور یہ نسبت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ یہ سب مغالطے اس حدیث کے تحت داخل ہیں

کہ جو شخص ایسی چیز ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہے تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

جیسا اللہ نے بنایا ہے ویسے ہی رہو

اور یہ سب گناہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو ایک مرتبہ کرلیا، بس وہ گناہ ختم ہوگیا، بلکہ چونکہ اس شخص نے اس نسبت کو اپنے نام کا جز بنا رکھا ہے، مثلاً لفظ مولانا یا ڈاکٹر یا پروفیسر وغیرہ کو اپنے نام کا حصہ بنا رکھا ہے، تو وہ گناہ مستقل اور دائمی ہے، اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلا جارہا ہے۔ اس لیے گناہ کو جھوٹ کے کپڑے پہننے سے تشبیہ دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس گناہ سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

ارے بھئی! اپنی کوئی صفت بیان کرنے میں کیا رکھا ہے، جیسا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ویسے ہی رہو اور بلا وجہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش میں نہ پڑو۔ بلکہ جو صفت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، بس وہی صفت ظاہر کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے کسی کو کوئی صفت دے دی، کسی کو کوئی صفت دے دی۔ زندگی کا یہ سارا کاروبار اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت سے چل رہا ہے، تم اس کے اندر دخل اندازی کر کے ایک غلط بات ظاہر کرو گے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوگی۔

مال داری کا اظہار

اسی طرح اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ایک آدمی زیادہ مال دار نہیں ہے، لیکن لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے آپ کو بہت مال دار ظاہر کرتا ہے

اور دکھاوے کے لیے ایسے کام کرتا ہے تاکہ لوگ مجھے زیادہ دولت مند سمجھ کر میری زیادہ عزت کریں۔ یہی دکھاوا ہے اور یہی نام ونمود ہے۔ یہ بات بھی اسی گناہ میں داخل ہے۔

نعمت خداوندی کا اظہار کریں

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر قربان جائیں، آپ نے ایسی ایسی باریک تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ آپ کی تعلیمات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو حکم علیحدہ علیحدہ ہیں: ایک حکم تو یہ ہے کہ جو صفت تمہارے اندر موجود نہیں ہے وہ ظاہر مت کرو تاکہ اس کی وجہ سے دوسرے کو دھوکا نہ ہو، لیکن دوسری طرف آپ ﷺ نے دوسری تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ يُّرٰى أَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ"(۱)

یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بندے کو جو نعمت عطا فرمائی، اس نعمت کے آثار اس بندے پر ظاہر ہوں۔ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے کھاتا پیتا بنایا ہے اور اس کو مال و دولت عطا فرمائی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنا رہن سہن ایسا رکھے جس سے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا اظہار ہو، مثلاً وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، صاف ستھرے گھر میں رہے۔ اگر وہ شخص اس دولت کی نعمت کے باوجود فقیر اور مسکین بنا پھرتا ہے، میلا کچیلا اور پھٹا پرانا لباس پہنا رہتا ہے اور گھر کو گندا رکھتا ہے، تو

---

(۱) سنن الترمذی ٤/٥١٠ (٢٨١٩) وقال هذا حديث حسن۔ومسند احمد ۱۵۹/۳۳ (١٩٩٣٤).

ایسی صورت بنانا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے۔ ارے بھائی! جب اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے آثار تمہاری زندگی پر ظاہر ہونے چاہییں۔ تمہاری صورت دیکھ کر کوئی تمہیں فقیر نہ سمجھ لے اور کوئی تمہیں مستحق زکوٰۃ سمجھ کر نہ دے دے۔ اس لیے جیسے حقیقت میں تم ہو ویسے ہی رہو۔ نہ تو اپنے آپ کو زیادہ ظاہر کرو اور نہ ہی اتنا کم ظاہر کرو جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہو۔

عالم کے لیے علم کا اظہار کرنا

علم کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے تو اب تواضع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی چھپ کر ایک کونے میں بیٹھ جائے، اس خیال سے کہ اگر میں دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو عالم ظاہر کروں گا تو اس کے نتیجے میں لوگ مجھے عالم سمجھیں گے اور یہ تواضع کے خلاف ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت عطا فرمائی ہے تو اس نعمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس علم کا اتنا اظہار کرے کہ جس سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے اور علم کی نعمت کا شکریہ بھی یہی ہے کہ بندوں کی خدمت میں اس علم کو استعمال کرے۔ وہ علم اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں دیا کہ تم تکبر کر کے بیٹھ جاؤ، وہ علم اس لیے نہیں دیا کہ اس کے ذریعے تم لوگوں پر اپنا رعب جماؤ، بلکہ وہ علم اس لیے دیا ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں کی خدمت کرو۔ لہٰذا دونوں طرف توازن برقرار رکھتے ہوئے آدمی کو چلنا پڑتا ہے، یہ سب دین کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
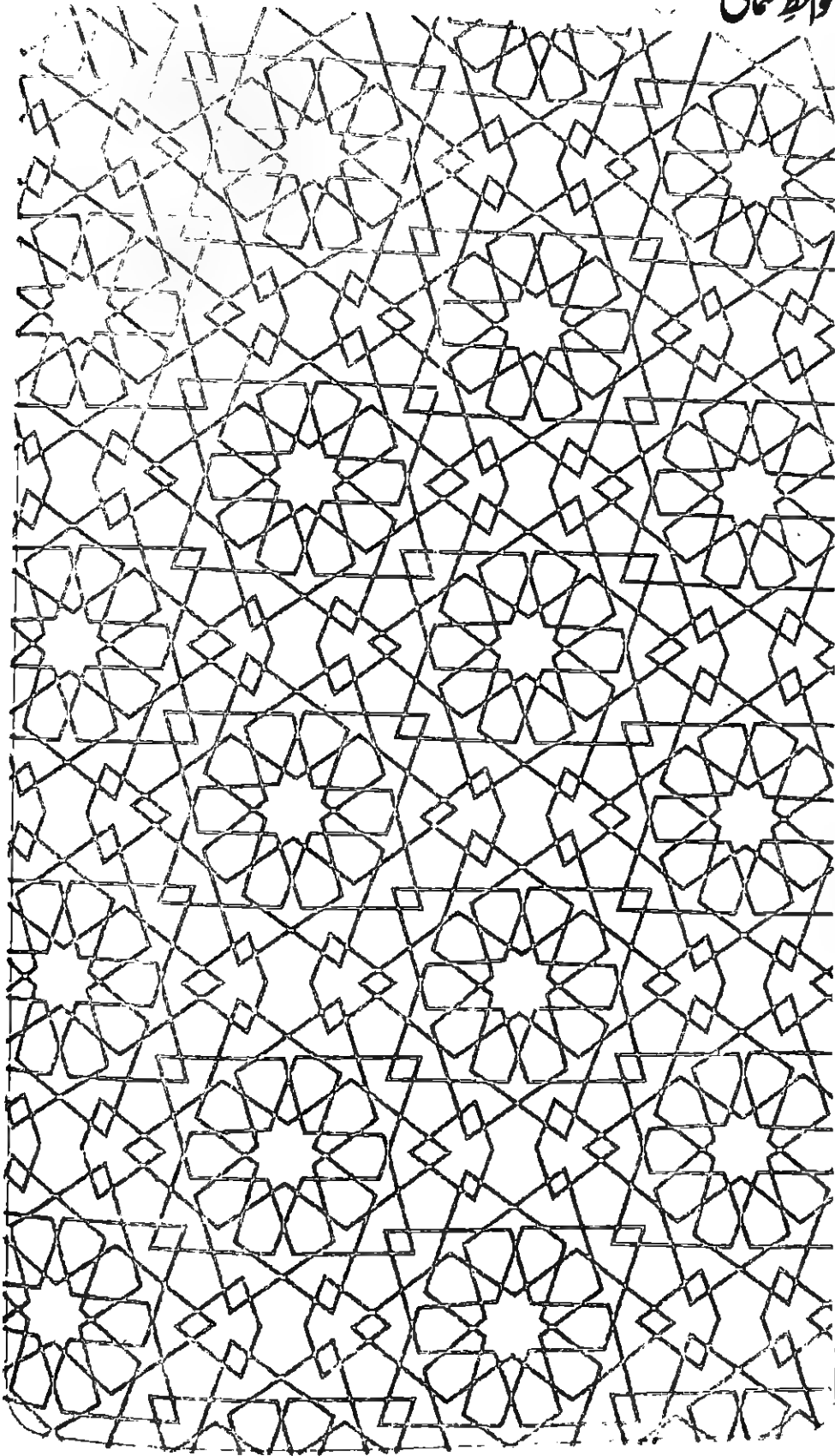
درس و تدریس کے ساتھ اصلاحِ اعمال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

درس و تدریس کے ساتھ اصلاحِ اعمال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ، وَالعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ!

کثرتِ ذکر اور اصلاحِ اعمال رکن طریق ہیں

حضرتِ والا نے ارشاد فرمایا کہ

اس طریق میں دو چیزیں ہیں: ایک کثرتِ ذکر، دوسرے اصلاحِ اعمال، سو کثرتِ ذکر تو حالتِ طالبِ علمی میں مناسب نہیں اور جو مقصود ہے کثرتِ ذکر سے، وہ ان کو مشغولئ علم سے حاصل ہوجاتا ہے بشرطِ تقویٰ، باقی رہا اصلاحِ اعمال، وہ ہر حال میں فرض ہے اور طالب علمی کی حالت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، سو اس کا سلسلہ شروع

کر دینا چاہیے، اس کی ترتیب یہ ہے کہ اول ''قصد السبیل'' کو دو بار بغور مطالعہ کر کے اس سے جو حاصل طریق کا ذہن میں آئے، اس سے اطلاع دے، پھر طریقۂ اصلاح کا پوچھے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۶۹)

کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کا مقصد

جب کسی اللہ والے کی طرف اور کسی شیخ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو رجوع کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دو چیزیں حاصل ہوں، ایک ''کثرتِ ذکر'' حاصل ہو جائے، جس سے ہر وقت ذہن اور دھیان اللہ جل شانہ کی طرف ہو جائے اور زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں تر رہے، ایک تو کثرتِ ذکر کی یہ نعمت حاصل ہو جائے۔ دوسری چیز ''اصلاحِ اعمال'' ہے، یعنی اعمال درست ہو جائیں، گناہوں سے حفاظت ہو جائے، معصیتوں اور منکرات سے حفاظت ہو جائے، فرائض و واجبات، سنن و مستحبات پر عمل ہونے لگے، اعمال کی طرف رغبت ہو جائے، ان کو کرنے کی توفیق ہو جائے۔ بہر حال! کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے سے یہ دو چیزیں حاصل کرنی اصل مقصود ہوتی ہیں۔

زمانۂ طالب علمی میں کثرتِ ذکر مناسب نہیں

لیکن ایک شخص جو علمِ دین کے کاموں میں مصروف ہے اور وہ اپنی اصلاح کے لیے کسی شیخ کی طرف رجوع کر رہا ہے تو کیا وہ طالب علم بھی شیخ کی طرف رجوع کرنے کے بعد انہی دونوں چیزوں کے حصول کی فکر میں مشغول ہو جائے؟ اس کے لیے حضرت والا نے فرمایا کہ ''کثرتِ ذکر تو حالتِ طالب علمی میں

مناسب نہیں''۔ یعنی کوئی طالب علم حالت طالب علمی میں درس و مطالعہ اور تکرار کے بجائے وظیفے پڑھ رہا ہے تو اس کے لیے یہ مناسب نہیں، اس کو تو یہ چاہیے کہ اپنے اسباق کی طرف اور اپنے مطالعے اور تکرار کی طرف متوجہ رہے تاکہ اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

مشغولیٔ علم سے کثرتِ ذکر کا مقصود حاصل ہے

البتہ اس پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص کثرتِ ذکر نہیں کرے گا تو کثرتِ ذکر کا جو مقصود ہے، وہ اس سے محروم ہوجائے گا؟ اس کے جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ ذکر کے فوائد سے محروم ہوجائے گا، بلکہ کثرتِ ذکر سے جو مقصود ہے، وہ اس شخص کو مشغولی علم ہی سے حاصل ہوجاتا ہے۔ البتہ اس کے حصول کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ ''تقویٰ'' ہو، یعنی اس کے اندر گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہو، آنکھ کی حفاظت، کان کی حفاظت، زبان کی حفاظت کا اہتمام ہو۔ دوسرے یہ کہ ''اخلاص'' ہو، کہ میں جو یہ علم حاصل کررہا ہوں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے حاصل کررہا ہوں، میں اگر پڑھا رہا ہوں، تو اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھا رہا ہوں تو اس صورت میں یہ درس و تدریس اور پڑھنا پڑھانا کثرتِ ذکر کے قائم مقام ہوجائے گا اور اس کے ذریعے کثرتِ ذکر کا مقصود حاصل ہوجائے گا۔

طالب علم کو کچھ ذکر ضرور کرنا چاہیے

لیکن طالب علم کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ذکر کرنے کی ضرورت نہیں،

اس لیے کہ یہ بات ''کثرتِ ذکر'' کی ہورہی ہے، مطلق ذکر کی بات نہیں ہورہی ہے، یعنی یہ درس و تدریس اور یہ مطالعہ ان شاء اللہ کثرتِ ذکر کے قائم مقام ہوجائے گا، لیکن کچھ ذکر پھر بھی کرنا ہوگا۔ لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ۔ ہر جگہ کا اور ہر موقع پر ایک تقاضا ہے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ چونکہ ہم درس و تدریس میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں ذکر و نوافل کی ضرورت نہیں، یہ سمجھنا درست نہیں۔ روایت میں ہے:

''تَدَارُسُ العِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَاءِهَا''[1]

یعنی علم کی مشغولی اور اس کا تکرار رات کے کسی ایک حصے میں کرلینا ساری رات جاگنے سے بہتر ہے۔

اگر کوئی شخص ساری رات تہجد پڑھ رہا ہے، اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ وہ رات کے ایک حصے میں یہ علمی کام کرلے، بشرطیکہ اس کے اندر اخلاص ہو۔ لہٰذا اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ساری عمر تہجد کی نماز نہ پڑھے، بس بیٹھا تکرار ہی کرتا رہے، اگر یہ مطلب ہوتا تو پھر صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور بزرگانِ دین میں سے کوئی بھی نفلی عبادت کا اہتمام نہ کرتے، حالانکہ یہ حضرات نفلی عبادات کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔

''علم'' کو مقصودِ زندگی بنانے والوں کی حالت

درحقیقت یہ بتانا مقصود ہے کہ دو طبقے تھے، ایک طبقہ وہ تھا جس نے اپنا مقصودِ زندگی علم کو بنایا تھا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے اپنا مقصود زندگی نفلی

(۱) سنن الدارمی ۳۲۲/۱ (۲۷۱) عن ابن عباس موقوفاً۔ طبع دار المغنی السعودیة.

عبادات کو بنایا تھا، لیکن ایسا نہیں تھا کہ جس نے اپنا مقصودِ زندگی علم کو بنایا تھا، وہ نفلی عبادات سے بالکل کورا اور بے نیاز تھا، بلکہ تھوڑی بہت نفلی عبادت اپنے حالات کے مطابق وہ بھی کرتا تھا ذکر وہ بھی کرتا تھا، نوافل وہ بھی پڑھتا تھا، تہجد وہ بھی پڑھتا تھا، لیکن صبح سے شام تک صرف اسی ایک کام میں نہیں لگا رہتا تھا۔

کس عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے؟

لیکن آج کل کے علماء کو یہ حدیث بہت یاد رہتی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ"(۱)

یعنی عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص پر فضیلت ہے۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ

"فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ"(۲)

یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت اور بھاری ہے۔

اس قسم کی احادیث ہم جیسے لوگوں کو بہت یاد رہتی ہیں، لیکن خوب سمجھ لیجیے

---

(۱) سنن الترمذی ٤/٤١٦ (٢٦٨٥) وقال هذا حديث حسن صحيح غريب۔ والمعجم الكبير للطبرانی ٨/٢٣٣ (٧٩١١) طبع مكتبة ابن تيمية القاهرة۔

(۲) سنن الترمذی ٤/٤١٣ (٢٦٨١) وقال هذا حديث غريب ولا نعرفه الا من هذا الوجه من حديث الوليد بن مسلم۔ وسنن ابن ماجه ١/٢١٢ (٢٢٢)۔

کہ ان احادیث میں عالم سے مراد وہ عالم ہے جو مشغولیت علم کے ساتھ ساتھ نفلی عبادات بھی کچھ نہ کچھ انجام دیتا ہو اور عابد سے مراد وہ عابد ہے جس نے عبادت میں مشغولیت کے ساتھ علم سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھا ہوا ہے۔

حدیث میں عالم اور عابد سے کون مراد ہیں؟

اس بات کو علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقدمے میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے، حالانکہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ عابد کی حیثیت سے مشہور نہیں ہیں، بلکہ وہ تو ایک عام مؤرخ کی حیثیت سے مشہور ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں ''عالم'' سے مراد وہ عالم ہے جس نے اپنا دن رات کا مشغلہ علم کو بنا رکھا ہے، لیکن وہ عبادات سے بے بہرہ نہیں اور ''عابد'' سے مراد وہ عابد ہے جس نے اپنا دن رات کا مشغلہ عبادت کو بنا رکھا ہے اور علم سے وہ بالکلیہ بے بہرہ نہیں۔ کیوں کہ اگر کوئی عابد ایسا ہے جس کا علم میں کوئی حصہ نہیں تو اس کی عبادت بے کار ہے، اسی طرح اگر کوئی عالم ایسا ہے جس کا عبادت میں کوئی حصہ نہیں تو اس کا علم بے کار ہے۔ (۱)

''علم''، عمل اور طاعت کے بغیر بے کار ہے

اسی طرح ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عالم ایسا ہے جو خالص علم میں مشغول ہے، عبادت کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں اور اصلاحِ

---

(۱) تاریخ ابن خلدون ۲۷۹/۱ المقدمة/ الفصل الحادی والثلاثون فی الخطط الدینیة الخلافیه۔

اعمال و اخلاق کی طرف دھیان نہیں، دوسری طرف وہ عابد ہے جو صرف عبادات میں مشغول ہے اور علم کی طرف بالکل دھیان نہیں، اگر ان دونوں کا تقابل کیا جائے تو ان میں عابد عالم سے افضل ہے۔ لہٰذا حدیث میں جس عابد اور عالم کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عالم اور عابد ہیں جو دونوں کے جامع ہوں، ورنہ نرا علم تو شیطان کے پاس بھی تھا، وہ بھی بہت بڑا عالم تھا، اس لیے اگر کوئی شخص نرا علم لے کر بیٹھ گیا، اب اس کا نہ عبادت میں کوئی حصہ ہے، نہ ہی گناہوں سے بچنے کی اس کو کوئی فکر ہے، نہ معصیتوں سے اجتناب کا کوئی اہتمام ہے، بلکہ اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے تو ایسا علم کس کام کا جو اس کو گناہوں سے نہ بچائے۔ ایسے شخص کے لیے قرآنِ کریم کی آیت ہے:

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝ (۱)

یعنی ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان آیتوں کو چھوڑ نکلا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں ہوگیا۔

لہٰذا ایسا علم جس کا ذکر اس آیت میں ہے، عابد سے کیسے افضل ہوسکتا ہے؟ بلکہ ایسے عالم سے تو عابد ہی افضل ہے۔ بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا کہ کثرتِ ذکر سے جو مقصود ہے وہ ان کو مشغولی علم سے حاصل ہوجاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے، وہ تھوڑا بہت تو ذکر کرے، لیکن وہ کثرتِ ذکر جو عابد کیا کرتا ہے، اس کا یہ مطالعہ، تکرار، یہ

(۱) سورۃ الاعراف آیت (۱۷۵).

درس و تدریس، یہ تصنیف و تالیف، یہ فتویٰ نویسی کثرتِ ذکر کے قائم مقام ہوجائے گا۔

آپ کو "قلت" سے مقصود حاصل ہے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ خط میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ "حضرت! دن رات کاغذ کالے کرنے میں وقت گزر جاتا ہے، آپ کی خانقاہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ آ کر کس طرح سے ذکر و اذکار میں مشغول ہوتے ہیں اور مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں، مجھ سے یہ سب نہیں بن پڑا، میں ان چیزوں سے محروم ہوں، تھوڑے سے معمولات ہیں، بس وہ ادا کرلیتا ہوں۔"

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ "جو مقصود ان کو کثرت سے حاصل ہے، الحمد للہ! وہ آپ کو قلت سے حاصل ہے۔" وجہ اس کی یہ ہے کہ بزرگوں نے فرمایا کہ

"كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ"

جو شخص اللہ کی اطاعت کا کوئی بھی کام کررہا ہے، وہ درحقیقت اللہ کا ہی ذکر کررہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اخلاص اور تقویٰ عطا فرمائے تو یہ سب کام بھی ذکر میں داخل ہیں۔

"قطبی" پڑھ کر ایصالِ ثواب

میں نے اپنے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ آپ کے پاس ایک شخص اپنے کسی عزیز کے لیے ایصالِ ثواب کرانے کے لیے

آیا۔ حضرت شیخ الہند اس وقت ''قطبی'' کا سبق پڑھا رہے تھے، فرمایا کہ ہم یہ قطبی کا سبق پڑھ کر تمہارے عزیز کے لیے ایصالِ ثواب کردیں گے۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ حضرت! قطبی پڑھ کر ایصالِ ثواب؟ ایصال ثواب تو قرآنِ کریم یا بخاری شریف وغیرہ پڑھ کر ہوتا ہے۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ہمارے نزدیک قطبی میں اور بخاری میں کوئی فرق نہیں، اس لیے کہ بخاری شریف پڑھنے سے جو مقصود ہے، قطبی پڑھنے سے بھی وہی مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ جو ثواب بخاری شریف پڑھنے سے ملتا ہے وہی ثواب قطبی پڑھنے پر بھی عطا فرمائیں گے، اگر نیت درست ہو۔

زمانہ طالبِ علمی میں اصلاحِ اعمال

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ

> باقی رہا اصلاح اعمال، وہ ہر حال میں فرض ہے، طالب علمی کی حالت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، سو اس کا سلسلہ شروع کردینا چاہیے۔

یعنی طالب علم ہو، یا غیر طالب علم ہو، اپنے اعمال کی اصلاح تو ہر ایک کو کرنی ہے، چنانچہ آپ نے سنا ہوگا کہ جب کوئی طالب علم کسی بزرگ کے پاس بیعت ہونے کے لیے جاتا ہے تو وہ بزرگ ان کو بیعت نہیں کرتے، بلکہ اس سے یہ فرماتے ہیں کہ جب تم فارغ ہوجاؤ گے اس وقت دیکھیں گے، لیکن دوسری طرف یہ بھی سنا ہوگا کہ بعض طالب علموں کا بزرگوں سے تعلق ہوتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایسی ''بیعت'' جس کے لوازم میں وظائف و اوراد کی کثرت

ہوتی ہے، وہ طالب علم کو بیعت نہیں کرتے، کیونکہ اس کے نتیجے میں اس کے درست مطالعہ اور تکرار میں حرج ہوگا اور اس کا ذہن ان اوراد و وظائف کی طرف متوجہ ہوجائے گا، لیکن جہاں تک اپنے اعمال اور اخلاق کی اصلاح کرانے کا تعلق ہے، اس تعلق میں طالب علم اور غیر طالب علم سب برابر ہیں۔

ابتداءً ''قصد السّبیل'' کا مطالعہ

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ

اس کی ترتیب یہ ہے کہ اول ''قصد السبیل'' کا دوبار بغور مطالعہ کرکے اس سے جو حاصل طریق کا ذہن میں آئے، اس سے اطلاع دے، پھر طریقہ اصلاح کا پوچھے۔

یعنی حضرتِ والا کا ایک رسالہ ہے ''قصد السبیل'' اس رسالے میں حضرت نے خلاصہ بیان فرمادیا ہے کہ کسی شیخ اور بزرگ سے تعلق قائم کرنے کا اور اس تصوف کا مقصد کیا ہے؟ چونکہ اس رسالے میں کچھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی تھے، جس کی وجہ سے عام لوگوں کو اس کے پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی، اس لیے میرے والدِ ماجد قدس اللہ سرہ نے اس رسالے کی تسہیل کردی ہے اور اس کا نام ''تسہیل قصد السبیل'' رکھ دیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس رسالے کو دو مرتبہ پڑھ لو، تاکہ بات ذہن میں بیٹھ جائے، اس کے پڑھنے سے یہ سمجھ میں آجائے گا کہ اس طریق اور تصوف کا حاصل کیا ہے؟ جب طریق اور تصوف سمجھ میں آجائے تو اب اپنے مصلح کو اور شیخ کو اطلاع کرتے رہو کہ میں یہ عمل کررہا ہوں اور یہ میرے حالات ہیں اور شیخ سے مشورہ لیتے رہو اور ہدایات طلب کرتے رہو۔

''مکاتبت'' کے ذریعے اصلاح کا آغاز

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ''تجدید'' کا مقام عطا فرمایا تھا، انہوں نے اس تصوف اور طریقت کے راستے میں ''مراسلت'' اور ''مکاتبت'' کا عجیب وغریب سلسلہ جاری فرمادیا۔ پہلے مکاتبت اور مراسلت کا ایسا اہتمام و انتظام نہیں تھا، بس یہ تھا کہ شیخ کی خدمت میں جاؤ اور ان کی صحبت میں بیٹھو اور ان کے پاس رہ کر اپنی اصلاح کراؤ، چلّے لگاؤ، مراقبات کرو، تب جا کر اصلاح ہوتی تھی۔ جب حضرت والا نے یہ دیکھا کہ لوگوں کے پاس اب وقت کہاں؟ فرصت کہاں؟ کہاں جاکر اپنی اصلاح کرائیں گے، اس طرح یہ لوگ اپنی اصلاح سے محروم رہ جائیں گے، اس لیے آپ نے فرمایا کہ شیخ سے ''مراسلت اور مکاتبت'' قائم کرو، یہ مراسلت ''صحبت'' کے قائم مقام ہوجاتی ہے، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے شیخ کے پاس اس کی صحبت میں وقت گزار رہا ہو، تب بھی بعض اوقات کوئی بات زبان سے کہنے میں دشواری معلوم ہوتی ہے، اس لیے شیخ سے جو بات کہنی ہو، وہ اس کو لکھ کر دے دو، پھر شیخ اس کو لکھ کر ہدایت اور راہ نمائی کردیتا ہے، پھر اس کی ہدایت پر عمل کرو، اس میں بڑی برکت ہے۔

''تربیت السالک'' مکاتبت کا نمونہ ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تربیت السالک'' تصوف کے باب میں عجیب وغریب نرالی چیز ہے، بڑے بڑے لوگ جو اپنے اپنے حالات لکھ بھیجتے تھے، حضرت والا اس کا حل لکھ کر بھیجتے، یہ کتاب اس منتخب مکاتبت اور مراسلت کا

مجموعہ ہے۔ ہم جیسے لوگ اس کی کیا قدر پہچانیں؟ جس پر حالات گزر رہے ہوں، جس کو سابقہ پیش آیا ہو، وہ اس کی قدر جان سکتا ہے کہ اس کے اندر کیسے ''جواہر'' موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نکھار کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو دین کی، تصوف کی، شریعت کی اور طریقت کی عجیب فہم عطا فرمائی تھی۔ بہرحال! یہ ''مراسلت'' اور ''مکاتبت'' بڑی کارآمد چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت عطا فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
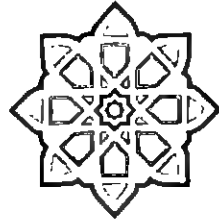
فضیلتِ علم وعلماء

(اصلاحی مواعظ ۱/۲۴۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فضیلتِ علم وعلماء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا،

أما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ،

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[1]

---

[1] سورۃ العنکبوت آیت (٦٩).

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! یہ بات میرے لیے ایک عظیم سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت ملک کی ایک مبارک دینی درس گاہ کے سالانہ جلسے میں شرکت کا شرف عطا فرمایا۔ یوں تو ملک بھر میں نہ جانے کتنی درس گاہیں، کتنے مدارس وادارے ہیں جن میں روزمرہ جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مدرسے کو جس میں ہم اور آپ اس وقت حاضر ہیں، ایک نمایاں امتیاز اور غیر معمولی مقام بخشا ہے اور وہ اس کے بانی ومؤسس حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے وجود بابرکت کی بنا پر۔ اس فضا میں حضرت کے انفاس طیبہ کی مہک محسوس ہوتی ہے اور ان کے وجودِ بابرکت کے اثرات اس کے در و دیوار سے نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص، جدوجہد اور ان کے جذبۂ دین کا ایک مظہر ہمیں اس مدرسے کی صورت میں دکھایا ہے۔ پورے ملک میں اللہ کے فضل وکرم سے اس مدرسے کی خدمات روزِ روشن کی طرح واضح ہیں، اس لیے اس مدرسے میں حاضری کو میں اپنے لیے باعث شرف وسعادت سمجھتا ہوں اوران تمام حضرات کو جو اس اجتماع میں شریک ہیں، مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ لوگ ایسی جگہ حاضر ہیں جو اللہ والوں کے ذکروفکر سے آباد رہی ہے اور جہاں ان کی نیک نیتی واخلاص کے آثار موجود ہیں اور یہ وہ حضرات ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"لَا یَشْقٰی جَلِیْسُهُمْ"

کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کبھی ناکام ونامراد نہیں ہوتا، اس لیے حاضرین اللہ کے فضل سے اس مجلس سے کچھ لے کر جائیں گے۔

دینی مدارس کی اہمیت

اس موقع پر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کچھ ان دینی مدارس کے بارے میں عرض کروں۔ یہ دینی مدارس جن کا جال الحمد للہ برصغیر ہند و پاک میں پھیلا ہوا ہے، بعض اوقات ان مدارس کے بارے میں یہ باتیں زبان پر آتی ہیں اور بعض ناواقفوں کی طرف سے یہ بات کثرت سے سننے میں آتی ہے کہ نہ جانے یہ دینی مدارس میں بیٹھنے والے دنیا کے حالات سے بے خبر، ناواقف کیا کام کریں گے۔ ایک پورا حلقہ اندرون و بیرون ملک باقاعدہ مشن کے تحت ان دینی مدارس کے خلاف پروپیگنڈے کرتا ہے کہ یہ لوگ دقیانوسی اور رجعت پسند ہیں اور یہ ملک و ملت کے لیے کوئی باعثِ فخر خدمت انجام نہیں دے رہے، لیکن میں یہ بات آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے یقین وایمان کی حد تک یہ بات مجھے روز روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے کہ یہ سادہ سے دینی مدارس مسلمانانِ ہند و پاک پر اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام واحسان ہیں کہ اگر پوری امت مسلمہ ساری عمر بھی اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہے، تب بھی حق شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ اگر برصغیر میں دین کی کوئی شمع روشن نظر آتی ہے اور صحیح دین کے کوئی نام لیوا نظر آتے ہیں تو وہ صرف ان بوریہ نشین علمائے کرام کی بدولت نظر آتے ہیں۔

دیگر اسلامی ممالک کا حال

میں آپ سے اپنے مشاہدے کی بات عرض کرتا ہوں کہ برصغیر سے نکل کر دیگر اسلامی ممالک بھی موجود ہیں، وہاں کے حالات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، لیکن وہاں پر دین کا وہ والہانہ جذبہ، اتباع نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہ شوق

اور اللہ کے دین کے لیے جذبہ فدا کاری جو آپ کو برصغیر میں نظر آتا ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی آپ کو ان ممالک میں نہیں ملے گا۔ اگر علم وتحقیق کی بات ہوتی تو بے شک دنیا کے دیگر ممالک میں علم وتحقیق کے ایسے بڑے بڑے ادارے موجود ہیں کہ جن کی سندوں کو ساری دنیا میں اہمیت دی جاتی ہے۔ مصر میں عظیم الشان درس گاہ ''جامعۃ الازہر'' ہے اور صدیوں سے وہاں تعلیم وتعلم کا کام ہورہا ہے، لیکن اگر اس کا موازنہ ''دارالعلوم دیوبند'' اور اس سے متعلقہ مدارس سے کر کے دیکھیں تو آپ کو زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔

وہاں پر بھی اگرچہ صحاحِ ستہ کا درس دینے والے موجود ہیں، فقہ وتفسیر کے مدارس بھی موجود ہیں، لیکن یہ دیکھ کر بعض اوقات خون کے آنسو رونے کو جی چاہتا ہے کہ استاد درس حدیث دے رہا ہے، لیکن سر سے لے کر پاؤں تک کوئی ایک نشانی عالمِ دین ہونے کی نظر نہیں آتی۔ تصنیفی وتحقیقی مقالے دیکھیں اور ان کے ماخذ دیکھیں تو واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑا عالم کوئی نہیں، لیکن اگر ان کے طرزِ زندگی کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ جو کچھ تعلیم دے رہے تھے، اس کا کوئی عکس ان کی ذاتی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں سے یہ مدارس ناکارہ قرار دے کر فنا کر دیے گئے، کھلی آنکھوں نظر آتا ہے کہ تصورِ اسلام بدل چکا ہے اور دین کا نقشہ تبدیل ہو چکا ہے، نہ جانے دین کا کون سا ایڈیشن ہے جس کو اسلام سمجھ کر اپنے آپ کو مسلمان اور اپنے ملک کو اسلامی ملک کہتے ہیں۔

یہ انڈونیشی اسلام ہے

مجھے چند برس پہلے انڈونیشیا جانے کا اتفاق ہوا، جس کا دارالحکومت ''جکارتہ''

ہے، جو بڑا عالیشان شہر ہے، تمدّن وترقی کے اعتبار سے بڑا عظیم الشان شہر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ اگر یہاں کوئی دینی درس گاہ ہو تو مجھے وہاں لے چلیے، وہ لوگ مجھے جکارتہ کی سب سے بڑی دینی درس گاہ میں لے گئے، میں بہت شوق سے چلا۔ عمارت بڑی زرق برق تھی۔ اندر جا کر انہوں نے سب سے پہلے پرنسپل سے ملاقات کرائی، میں نے دیکھا تو سر سے پاؤں تک کوئی اسلامی وضع قطع کا نشان پرنسپل صاحب میں نظر نہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ دیکھنا چاہتا ہوں، وہ مجھے درس گاہوں میں لے گئے، جب میں دارالحدیث میں پہنچا تو حیرت، افسوس اور صدمے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا کہ عورتیں اور مرد ایک ساتھ حدیث کا درس لے رہے ہیں، میں نے پرنسپل سے پوچھا کہ درسِ حدیث میں بھی مخلوط تعلیم ہے؟ انہوں نے ذرا سی آہ بھر کر کہا کہ ہاں! یہ ہمارا انڈونیشی اسلام ہے اور اسی اسلام کی ہم یہاں تعلیم دے رہے ہیں۔
اس وقت مجھے ان بے رونق دینی مدارس اور بوریہ نشیں علماء کی قدر و قیمت معلوم ہوئی، جنہوں نے ان مدارس کو اتباعِ سنت کی راہ پر گامزن کیا۔ ہمارے وہ اکابر حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی رحمہما اللہ اور ان کے متبعین اور ان کے شاگرد جنہوں نے قریہ قریہ، بستی بستی اسلام کی شمع روشن کی اور دین کو صحیح شکل میں ہم تک پہنچایا، ان مدارس ہی کو اللہ تعالیٰ نے صحیح دین کی حفاظت وصیانت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

مسلمانوں کی پستی

ایک اور بڑے اسلامی ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نام اس لیے نہیں لیتا کہ تحقیر مقصود نہیں، محض تنبیہ مقصود ہے کہ اس نعمتِ خداوندی کا جس قدر ہو سکے

شکر ادا کریں اور اسلام کے ان قلعوں کی حفاظت کریں۔ اس ملک کے جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے وہاں ہر کمرے میں ایک فریج رکھا ہوا تھا، جس میں اوپر سے نیچے تک مختلف قسم کی شراب رکھی ہوئی تھی اور لکھا ہوا تھا کہ آپ کی خدمت کے لیے نوع بنوع شراب حاضر ہے، تاکہ آپ کو بیرے کو بلانے کی زحمت نہ ہو اور آپ آسانی سے نوش فرمالیں اوراس کے ساتھ ایک بل رکھا ہوا ہے، جس پر یہ درج کردیں کہ کون سی قسم کی شراب استعمال کی گئی ہے۔ پینے کا یہ حال کہ وہاں کے گلاس کو بھی استعمال کرتے ہوئے خوف محسوس ہورہا تھا کہ نہ جانے اس میں کیا کچھ پیا گیا ہوگا۔ کھانے کا یہ حال کہ بازار میں نکلے تو دیکھا کہ گوشت بک رہاہے، معلوم کیا تو بتایا گیا کہ یہاں کے لوگوں کی بہت مرغوب غذا ہے اورلوگ اسے بہت شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ خنزیر کا گوشت ہے جو ہر بازار میں بلاتشویش وفکر بک رہاہے، یعنی یہ احساس بھی نہیں کہ کوئی برا کام ہورہاہے۔ اتفاقاً ایک محفل میں جانے کا اتفاق ہوا جو سیرتِ طیبہ کے نام پر منعقد کی گئی تھی اور وہ ایک ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی، ہمیں بھی وہاں لے جاکر ٹھہرا دیا گیا۔ استنجاء کی ضرورت پیش آئی تو پورے ہوٹل میں کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں تھی جس سے انسان بشری طور پر طہارت وپاکیزگی حاصل کرسکے۔

میں اس کانفرنس میں پڑھنے کے لیے ایک مقالہ لکھ کرلے گیا تھا، لیکن طبیعت پر ایسا انقباض ہوا کہ وہ مقالہ تو رکھا ایک طرف اور فی البدیہہ جو کچھ کہا اس کا حاصل یہ ہے۔

قول وفعل میں تضاد

ہم یہ کانفرنس تو کررہے ہیں سیرت کے نام پر، لیکن یہ بتایئے کہ کیا اس

میں سر سے پاؤں تک، رہنے کے کمروں سے لے کر بیت الخلاء تک کوئی ایک چیز بھی سیرتِ نبوی ﷺ سے مناسبت رکھتی ہے؟ مقالے سیرت پر پڑھے جارہے ہیں اور حال یہ ہے کہ جلسے میں دور دور تک کوئی نشانِ سنت نہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی طریقِ نبوی ﷺ پر استنجاء کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا تو پھر آخر اس کانفرنس کا کیا حاصل؟

اکابرِ دیوبند کی خدمات

ان ممالک میں اگر دینی انحطاط کے اسباب پر غور کیا جائے تو اس کے سوا اور کوئی سبب نظر نہیں آتا کہ انگریز یہاں بھی آیا، انگریز وہاں بھی آیا، اس نے سازشیں یہاں بھی کیں، وہاں بھی کیں، لیکن فرق جو نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں پر یہ بوریہ نشین اور دینی درس گاہیں موجود تھیں، جہاں پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر کیا جاتا ہے، دنیا سے منہ موڑ کر، روکھی سوکھی کھا کر، موٹا چھوٹا پہن کر، اللہ کے دین کی خدمت کے لیے کمر باندھ رکھی تھی اور دنیا سے منہ موڑ کر صرف اسی اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جہاں کہیں سے ان مدارس کو فنا کیا گیا وہاں پر سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا شوق بالکل مفقود ہوگیا۔

دراصل جو نگہبان و گلہ بان تھے، ان کو ختم کر دیا گیا اور عوام کا سارا کا سارا ریوڑ بغیر گڈریے اور چرواہے کے رہ گیا اور جس بھیڑیے نے چاہا سب بھیڑ کو پھاڑ ڈالا، جس نے چاہا دبوچ کر کھالیا۔ اس کے مقابلے میں جب اپنے ملک کا حال دیکھتے ہیں تو حقِ شکر ادا نہیں کرسکتے اور یہ صدقہ ہے حضرت نانوتوی، حضرت

گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہم کا جنہوں نے دنیا کی ہر خواہش کو چھوڑ کر صرف ایک چیز کو مقصد بنایا کہ انگریز کی اس سازش کا مقابلہ کیا جائے، کیونکہ انگریز یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے ایمان واسلام کا بیج نکالا جائے۔ ان ہی اکابر نے ۱۸۵۷ء میں بزروِ بازو شاملی کے میدان میں مقابلہ کرنا چاہا، لیکن جب دیکھا کہ وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے تو ہر قسم کی سیاسی وسماجی تحریکات سے منہ موڑ کر گوشہ نشین ہو کر سوچا کہ اب یہ دین جس پر حملے ہو رہے ہیں، اسے جس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے، اس کو صحیح شکل وصورت میں محفوظ رکھیں، تاکہ ہماری آنے والی نسلیں جب دین کی طرف متوجہ ہوں تو کم از کم ان کو صحیح شکل وصورت میں دین مل جائے۔ اس کام کے لیے کیا کچھ قربانیاں نہیں دیں؟ کیا کچھ مشقتیں نہیں اٹھائیں؟ معاش کے دروازے ان پر بند کردیے گئے۔

سلطان تغلق کے زمانے میں صرف دہلی شہر میں ایک ہزار دینی مدارس تھے، لیکن انگریز کے آنے کے بعد ان کو فنا کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ منصوبہ بنایا گیا کہ تمام سرکاری نوکریاں اور معاش کے تمام ذرائع ان لوگوں پر بند کردیے جائیں، تاکہ یہ بھوک وفاقے سے گھبرا کر دینی تعلیم وتعلم کو چھوڑ دیں، لیکن قربان جایئے ان نفوس قدسیہ کے جنہوں نے تمام مفادات کو ٹھکرا کر اس دین خداوندی کو صحیح شکل وصورت میں محفوظ رکھنے کی سعی فرمائی اور اسی غرض کے لیے دارالعلوم دیوبند قائم ہوا۔ یہ مدارس کتنے بے وسیلہ سہی، کتنے سادہ سہی، کتنے ہی بے رونق سہی، لیکن اس بات کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ الحمدللہ! دشمنانِ دین پر ان مدارس

کا ایک رعب طاری ہے اور جب تک یہ مدارس اپنی صحیح ڈگر پر قائم ہیں، ان شاء اللہ کوئی میلی آنکھ سے ان کو نہیں دیکھ سکتا اور اسی رعب کا نتیجہ ہے کہ دین صحیح شکل میں قائم ہے۔ الحمدللہ ہم سب اپنا تعلق دیوبند سے جوڑتے ہیں اور یہ بات ہمارے لیے باعثِ فخر وشکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اکابر سے ہمارا دامن وابستہ فرمایا۔

دارالعلوم کس چیز کا نام ہے؟

لیکن سمجھنا یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کس چیز کا نام ہے؟ وہ دارالعلوم جس نے برِ صغیر میں دین کو محفوظ رکھا اور شمع دین روشن کی، آیا دارالعلوم عمارتوں کا نام ہے؟ یا شخصیات کا نام ہے؟ یا علم وتحقیق کا نام ہے؟ اگر نام ہوتا محض علم وتحقیقات کا، مقالات ودرس گاہوں کا تو یہ کوئی امتیازی شان نہیں، یہ تو دنیا کی بہت سی درس گاہوں میں موجود ہے۔ جامعۃ الازہر سے ایسے ایسے تحقیقی مقالے شائع ہوتے ہیں جن کی نظیر لانا ممکن نہیں۔ مسلمان تو دور کی بات ہے، بہت سے ملحد، یہودی اور نصرانی اسلام پر تحقیقی کتابیں لکھ رہے ہیں، اس میں حوالوں کی فہرست دیکھی جائے تو اچھا خاصا عالم بھی ان کے ناموں سے انجان اور ناواقف نظر آئے گا۔ اگر دارالعلوم دیوبند محض تحقیق وعلم کا نام ہوتا تو یہ اور بھی کئی جگہ نظر آئے گا۔

امامِ رازی اور شیطان

میرے والدِ ماجد، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ اگر تنہا علم ہی مقصود ہوتا اور تنہا علم ہی باعث نجات ہوتا تو

اس کائنات میں شیطان سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ اتنا بڑا عالم ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم و فلسفی کو بھی پریشان کر دیا اور عین نزع کے وقت ان کے پاس آ دھمکا کہ امام صاحب! آپ دوسرے عالم کی طرف جا رہے ہیں، معلوم نہیں جنت میں داخلہ ہو یا جہنم سے سابقہ پڑے، یہ تو بتایئے کہ کیا چیز لے کر جا رہے ہیں؟ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں تو کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کی دولت لے کر جا رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے کلمہ پڑھنے والے کے لیے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے، شیطان نے کہا: حضرت! آپ توحید کے قائل تو ہیں، لیکن کیا آپ کے پاس کوئی دلیل بھی ہے؟ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی عقائد و کلام کی بحثیں کرتے ہوئے اور توحید کے دلائل دیتے ہوئے گزری تھی، ان کے پاس دلائل کی کیا کمی تھی؟ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلیل دی تو شیطان نے کہا کہ اس پر تو فلاں اعتراض وارد ہوتا ہے، اس لیے یہ دلیل مکمل نہیں، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری دلیل دی، شیطان نے اسے بھی توڑ دیا، اسی طرح تیسری دلیل کو بھی توڑ دیا، یہاں تک کہ ۱۰۱ دلائلِ توحید بیان فرمائے، لیکن شیطان نے ہر ایک کو توڑ ڈالا۔

اب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حالت غیر ہوگئی کہ جو کچھ عقلی دولت تھی وہ تو سب کی سب ابلیس نے توڑ کر رکھ دی، لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمانا تھا، ورنہ خدانخواستہ عین نزع کے وقت ایمان میں کچھ تزلزل پیدا ہو جائے تو ساری عمر کی کمائی دھری رہ جائے گی اور فضل اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے فرمایا کہ اس وقت ایک بڑے اللہ والے بزرگ تھے، شیخ نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ، جن کی خدمت میں ایک مرتبہ امام صاحب رحمہ اللہ چلے گئے تھے اور ان سے کچھ تعلق بھی قائم ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اس طرح مدد فرمائی کہ حضرت شیخ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ کی صورت ان کے سامنے آ گئی اور یوں لگا، جیسے حضرت شیخ فرما رہے ہیں کہ ارے! کہہ دے کہ میں خدا کو بے دلیل ایک مانتا ہوں، کیونکہ یہ سارے دلائل

شیطان توڑتا رہے گا، چنانچہ اللہ نے فضل فرمایا اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ دیا کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں، یہ کہا اور اللہ نے اپنے پاس بلا لیا۔

تنہا علم کچھ نہیں

حقیقت میں تنہا علم کچھ بھی نہیں، علم اس وقت باعث فضیلت بنتا ہے، جب اس پر عمل بھی ہو اور علم بلا عمل بے کار ہے۔ ہمارے حضرات علماء دیوبند کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے محض درس گاہیں ہی قائم نہیں کیں، بلکہ وہ جس طرح ایک درس گاہ تھی، وہیں ایک خانقاہ وتربیت گاہ بھی تھی، ہر استاذ و شاگرد کے درمیان ایسا تعلق تھا، جیسا کہ شیخ ومرید کے درمیان ہوتا ہے اور یہ نہیں کہ محض زبان سے حدیث کا ترجمہ پڑھ کر، اس کی تحقیق کر کے سمجھا دیا، بلکہ اپنے عمل سے اس حدیث کا پیکر بن کر دکھایا، تب یہ نتیجہ نکلا کہ شاگردوں میں اتباع سنت کا شوق پیدا ہوا اور اللہ کو جو صفات مطلوب ہیں، وہ صفات طلبہ میں پیدا ہوئیں اور پھر اسی تربیت سے حضرت شیخ الہند، حضرت مدنی اور حضرت تھانوی رحمہم اللہ جیسی شخصیات پیدا ہوئیں۔ یہ صرف حروف ونقوش کا کام نہیں تھا، کیونکہ کتابیں پڑھ کر اگر شخصیات بنی ہوتیں تو پھر وہ یہودی جو برطانیہ وجرمنی میں اسلام پر تحقیق کر رہے ہیں، وہ بہت بڑے صالح ہوتے۔ دراصل یہ وہ دینی مذاق ومزاج اور فدا کاری تھی جو گھول کر پلا دیا کرتے تھے، پھر اتباع سنت کا جذبہ اساتذہ سے شاگردوں کی طرف منتقل ہوتا تھا، اس جذبے سے یہ شخصیات بنی ہیں۔

اصلاح کا طریقہ

اصلاح کا وہ طریقہ جو حضور اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک چلا

آرہا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا چاہیں تو وہ کارگر نہیں ہوسکتا۔
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لَنْ یَصْلُحَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا"(۱)

اس امت کے آخر زمانے کے لوگوں کی اصلاح صرف اسی طریقے سے ہوسکتی ہے جس طرح کہ اس امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی اور وہ اصلاح یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کوئی کتاب پڑھائی تھی اور نہ ہی کوئی تحقیقی مقالے پڑھ کر سنائے تھے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، لیکن اُمّی ہونے کے باوجود پوری کائنات کے سب سے بڑے عالم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت قول سے زیادہ عمل سے تھی، جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے جانثار وفداکار تیار ہوئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور القابات

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات کو دیکھیں تو وہاں آپ کو اس قسم کے القاب و آداب نہیں ملتے، جیسے کہ آج کل لوگ بڑے بڑے علماء کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کسی کو کہا جارہا ہے "راس المحققین"، "خاتم المحدثین"، "امام الاتقیاء"، "زبدۃ الازکیاء"۔ نہ

(۱) الشفا القاضی عیاض: ۸۸/۲، طبع دار الفکر۔

جانے کیا کیا القاب ہیں، لیکن کیا کبھی ایسا بھی سننے میں آیا؟ کہ کسی نے کہا ہو امام المحدثین، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا کہا ہو رئیس المتکلمین، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یا کہا ہو مفکرِ اسلام عثمان غنی رضی اللہ عنہ۔ ایسا کوئی لقب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ القاب بعد کے لوگوں کے ساتھ لگاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کہا جاتا ہے، لیکن کوئی امام عمر رضی اللہ عنہ نہیں کہتا، امام عثمان رضی اللہ عنہ نہیں کہتا۔ بات یہ ہے کہ جب آپ نے کسی صحابی کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہہ دیا، یعنی یہ کہہ دیا کہ وہ صحابی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ساری صفات کمال آپ نے ان کے اندر جمع کر دیں۔ جب کہہ دیا کہ فلاں شخص صحابی ہے تو معنی یہ ہے کہ وہ فقیہ بھی ہے، متکلم بھی ہے، مجاہد بھی ہے، غرض یہ کہ جتنی صفات اللہ کی پسندیدہ ہیں، وہ تمام اس بندے میں جمع ہیں، اس لیے کسی صحابی کو ان القاب و آداب کی ضرورت نہیں، وہ ان سے بے نیاز ہیں۔ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ ایک شخص نے جا کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے شکایت کی کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں، یعنی تین کی بجائے ایک پڑھتے ہیں تو جواباً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

”دَعْهُ فَإِنَّهُ قَدْ صَحِبَ رسول الله ﷺ“(۱)

ارے! چھوڑو ان باتوں کو، یہ تو نبی کریم ﷺ کے صحبت یافتہ شاگرد ہیں، تم کیوں اعتراض کرتے ہو؟

کون افضل ہے؟

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا! بتایئے کہ حضرت

(۱) صحيح البخاري: ۲۸/۵ (۳۷٦٤).

معاویہ رضی اللہ عنہ وعمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ میں سے کون افضل ہے؟ سوال کرنے والے نے ایسی ہوشیاری سے کام لیا کہ ادھر تو لیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو کہ مخالفتِ علی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے لوگوں کی مخالفت کا شکار ہیں، دوسری طرف لیا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کو جو تھے تو تابعی، لیکن باعتبارِ صفات اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر ثانی بنایا تھا اور ان کو بہت اونچا مقام دیا تھا، یہاں تک کہ ان کی خلافت کو بھی بعض لوگوں نے خلافتِ راشدہ قرار دیا ہے۔ خیال یہ تھا کہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ چکر میں آجائیں گے، لیکن عبد اللہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ نے جو کچھ جواب ارشاد فرمایا، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ تم موازنہ کرتے ہو معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان؟ خدا کی قسم! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ کی ناک میں جو مٹی پڑی تھی، وہ ہزار عمر بن عبد العزیز سے بہتر ہے۔ حالتِ ایمان میں جس پر ایک نگاہِ نبوت پڑ گئی اس کی کایا پلٹ گئی۔ (1)

صحبت کی برکت

درحقیقت دین منتقل ہوا صحبت کے ذریعے، یہ دین صحابہ رضی اللہ عنہم سے تابعین کی طرف منتقل ہوا، تابعین رحمہم اللہ سے تبع تابعین کی طرف منتقل ہوا اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری وساری ہے۔ محض حروف ونقوش سے علم حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی اخلاق مجلّٰی ہوتے ہیں اور یہ ہی وہ راز تھا جسے حضرات علمائے دیوبند نور اللہ مراقدہم نے جان لیا تھا ؂

(1) البداية والنهاية لابن كثير ١٤٨/٨ طبع دار إحياء التراث العربي.

نہ کتابوں سے، نہ کالج سے، نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی، آدمی بناتے ہیں

اسی راز کو جاننے کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو علم و تحقیق کے سمندر بہہ رہے ہیں، تو دوسری طرف اتباعِ سنت، سادگی اور ایثار کا ایسا پیکر نظر آرہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علم کا وہ بحرِ بیکراں تھے، جنھوں نے بڑے بڑے پادریوں، آریہ سماجیوں کو چند لمحوں میں ڈھیر کردیا، بڑے بڑے معقولات کے جاننے والوں اور مناظر لوگوں کو ذرا ذرا سی بات میں شکست دے دی اور تصنیف و تحقیق کا یہ عالم کہ صرف ایک کتاب ''آبِ حیات'' کو لے لیجیے! اچھا خاصا فارغ التحصیل بھی اپنے حواسِ خمسہ ظاہرہ وباطنہ کو متوجہ کرکے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکتا، لیکن حالت یہ کہ تہبند باندھے ہوئے ہیں اور ایسی وضع قطع کہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ یہ تو کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نہیں، چہ جائیکہ اتنا بڑا عالم ہو اور خود فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر دو حرف علم کی تہمت قاسم پر نہ ہوتی تو دنیا کو پتا بھی نہ چلتا کہ قاسم کہاں پیدا ہوا تھا اور کہاں مرگیا؟ لیکن اس کے باوجود اپنی اصلاح کے لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ رسمی علوم کے اعتبار سے صرف کافیہ، قدوری تک پڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس پہنچ کر عرض کرتے ہیں کہ حضرت مجھے بیعت فرمالیجیے، اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیجیے اور میری اصلاح فرما دیجیے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا غضب کیا؟ آپ نے تو لٹیا ڈبو دی،

چاہیے تو یہ تھا کہ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی خدمت میں حاضری دیتے، زانوئے تلمذ تہہ کرتے، الٹا آپ ان کے پاس چلے گئے۔

اہل اللہ کی مثال

جواباً حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں! میں ایک مثال دیتا ہوں، اس سے بات سمجھ میں آجائے گی کہ ہم میں اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گلاب جامن کے بارے میں بڑی تحقیق کی ہو کہ کیسے بنتی ہے؟ کیا کیا اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، لیکن اگر کوئی پوچھے کہ آپ نے کھائی بھی ہے؟ تو وہ کہے کہ میاں! کھائی تو نہیں۔ بھائی آپ کو اس کی مکمل تاریخ معلوم ہے، شجرۂ نسب سے بھی واقف ہیں، لیکن ذائقے سے ناواقف ہیں اور دوسرا وہ شخص ہے جسے کچھ بھی نہیں معلوم کہ گلاب جامن کب ایجاد ہوئی؟ کس نے ایجاد کی اور اجزاء ترکیبی کیا ہوتے ہیں؟ لیکن وہ صبح وشام کھاتا اور اس کی لذت سے آشنا ہے۔

فرمایا کہ ہماری مثال اس کی سی ہے جو گلاب جامن کی تاریخ وترکیب سے تو واقف ہے، لیکن ذائقے سے نا آشنا ہے، دین کے علوم سے ہمیں واقفیت تو ہے، لیکن عمل کا ذائقہ ابھی تک نہیں چکھا اور اسی عمل کے ذائقے کو چکھنے کے لیے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا ہوں۔ آپ دیکھیں کہ علم کا بحر ناپید کنارا بھی اپنے آپ کو محتاج اصلاح سمجھتا ہے۔ اس بات کا محتاج سمجھتا ہے کہ کوئی میرے اخلاق کو مجلّٰی ومصفّٰی بنائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایک ایسے شخص کے پاس جا رہا ہے جو بظاہر امّی ہے۔

دیوبند نام ہے پورے دین کا

یہ خصوصیت ہے علمائے دیوبند کی جس کے بارے میں بعض لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ دیوبند نام ہے کسی جماعت اور فرقے کا۔ درحقیقت دیوبند نام ہے پورے دین کا اور دین کی اس تعبیر وتشریح کا جو سرکارِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا فرمائی۔ یہ علمائے دیوبند ہمارے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نمونے پیش کرگئے ہیں اور ایسے نمونے پیش کرگئے ہیں کہ آج دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور کچا مکان

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں، دارالعلوم دیوبند کے محدث تھے اور ابوداؤد شریف پڑھایا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب نے سنایا کہ دیوبند میں حضرت میاں صاحب کا مکان کچا بنا ہوا تھا، جب بھی برسات آتی تو کبھی چھت گرگئی تو کبھی دیوار گرگئی، ہر مرتبہ برسات کے بعد مکان کی مرمت کرنی پڑتی۔ ایک مرتبہ والد صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت آپ ہر مرتبہ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں، بار بار مکان گرتا ہے، پھر بنواتے ہیں تو ایک ہی مرتبہ پکا بنوالیں۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے، فرمایا کہ واہ واہ! مولوی شفیع! تم نے بڑی عقل کی بات کی، ہم اتنے بوڑھے ہوگئے، ہمیں تو یہ بات آج تک سمجھ میں نہ آئی کہ ایک ہی دفعہ پکا کروالیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں بہت شرمندہ ہوا اور عرض کیا کہ حضرت! مشورہ دینا مقصود نہیں تھا، میں وہ حکمت معلوم کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے آپ اپنا مکان پکا نہیں بنواتے، فرمایا کہ

بھائی بات تو تم نے بڑی اچھی کی اور میرے پاس اتنے پیسے بھی ہیں کہ پکا کروالوں، لیکن آؤ! آج تم کو دکھا دوں۔ یہ کہہ کر ہاتھ پکڑا اور چل پڑے اور فرمایا کہ دیکھو! جس محلے میں میرا گھر ہے، اس میں اوّل سے آخر تک سب مکان کچے ہیں، کیا اچھا لگے گا کہ اصغر حسین مکان پکا کر کے بیٹھ جائے؟ ہے کوئی جو ایسی مثال پیش کرے؟

أولٰئِك آبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
اِذَا جمعْتَنَا يَا جَرِيْرُ الـمَجَامِعِ

مساوات کے نعرے لگانے والے اور ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر فلسفۂ مساوات بگھارنے والے بہت ہیں، لیکن یہ علمائے دیوبند تھے جنہوں نے مساواتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ پیش کر کے دکھایا، یہ بوریہ نشین اور چٹائیوں پر بیٹھنے والے ہی تھے جنہوں نے مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا، یہ ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر فلسفۂ مساوات بگھارنے والے کتنے بڑے فرعون ونمرود ہیں۔ ان کے ملازمین سے معلوم کریں تو سب حقیقت واضح ہوجائے گی۔

ایک یہ فلسفہ مساوات بگھارنے والے ہیں اور ایک سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا آتی ہیں، یارسول اللہ! چکی پیستے پیستے ہاتھ میں گڑھے پڑگئے ہیں، پانی کی مشکیں ڈھوتے ڈھوتے سینے پر نیل پڑ گئے ہیں، براہِ مہربانی! کوئی ایک خادم عنایت فرمادیجیے، تاکہ گھر کے کام کاج کرنے میں آسانی ہوجائے۔ اگر جنت کی ملکہ کو ایک خادمہ مل جاتی تو قیامت نہ آجاتی، مگر سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک اہلِ صفہ کا انتظام نہیں ہوتا رسولِ خدا کی بیٹی کو خادمہ نہیں مل سکتی، تم نوکرانی اور خادمہ کی فکر چھوڑ دو، میں تمہیں ایسی بات

بتاتا ہوں جو دنیا وآخرت میں کام آئے گی اور کبھی بھی تھکن نہیں ہوگی اور وہ یہ کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔(۱) ان تسبیحات کو اسی لیے تسبیح فاطمی کہتے ہیں۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیسا نمونہ مساوات پیش کیا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جا رہے ہیں اور غلام اونٹ پر سوار ہے اور عمر رضی اللہ عنہ اونٹ کی نکیل پکڑے چل رہے ہیں۔(۲) اس بیسویں صدی میں اگر اس مساواتِ محمدی کے نمونے نظر آئیں گے تو ان حضراتِ علمائے دیوبند میں نظر آئیں گے اور جس چیز نے ان علمائے دیوبند کو امتیاز بخشا، وہ دراصل علم پر عمل کر کے اتباعِ سنت کا نمونہ پیش کرنا تھا۔

دار العلوم کا امتیاز

میرے دادا، حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کے بالکل ابتدائی طالب علموں میں سے تھے، وہیں پلے بڑھے اور وہیں فارغ التحصیل ہوئے، پھر وہیں پر پڑھانا شروع کیا اور آخری وقت تک درجہ فارسی میں خدمت انجام دیتے رہے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے دار العلوم کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ جس میں ایک شیخ الحدیث اور صدر مدرس سے لے کر ایک چوکیدار اور چپڑاسی تک ہر شخص صاحبِ نسبت ولی اللہ بھی تھا۔ دراصل دار العلوم دیوبند نام ہے اس شجر طیبہ کا جس کی شاخوں سے اتباعِ سنت، ایثار، سادگی اور فدا کاری کی نوع بنوع شاخیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہی

---

(۱) صحیح البخاری ۸۴/۴ (۳۱۱۳) وصحیح مسلم ۲۰۹۱/۴ (۲۷۲۷).

(۲) خطبات حکیم الامت ۲۶/ ۳۴۱ طبع ادارۃ تالیفات اشرفیہ۔ وتاریخ اسلام نجیب آبادی ۱/ ۳۰۷ طبع نفیس اکیڈمی لاہور۔

جذبات منتقل ہوتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے ہمیں ان بزرگوں کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔

آج اس اجتماع کی ابتداء کے موقع پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ ابتدا شکر سے کی جائے کہ یا اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں اس گروہ اور طائفے کے ساتھ وابستہ کیا۔ خدانخواستہ اگر ہم کسی کافر کے گھر پیدا ہوجاتے یا کسی گمراہ شخص کے گھر جنم لیتے تو ہمارا کیا بنتا؟ لہٰذا ان مدارس کی قدر پہچانیں یہ درحقیقت ہمارے اکابر کا ترکہ وورثہ ہیں۔ اللہ ہم سب کو ان مدارس کی حفاظت اور مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اگر ہم اخلاص کے ساتھ کام کریں گے تو نصرتِ خداوندی شاملِ حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مدارس کی اہمیت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
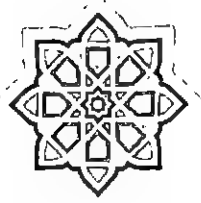
علماء کی توہین سے بچیں

(اصلاحی خطبات ۸/ ۲۴۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علماء کی توہین سے بچیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِينُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا،

اما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ

قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : «اِتَّقُوْا زَلَّةَ الْعَالِمِ وَلَا تَقْطَعُوْهُ وَانْتَظِرُوْا فَيْئَتَهُ »(۱)

یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے تمام امت نے اس کو قبول کیا ہے، اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے بڑا اہم نکتہ بیان فرمایا ہے۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

"عالم کی لغزش سے بچو اور اس سے قطع تعلق مت کرو اور اس کے لوٹ آنے کا انتظار کرو"۔

"عالم" سے مراد وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کا علم، قرآن کریم کا علم، حدیث کا علم، فقہ کا علم عطا فرمایا ہو، آپ کو یقین سے یہ معلوم ہے کہ فلاں کام گناہ ہے اور تم یہ دیکھ رہے ہو کہ ایک عالم اس گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے اور اس غلطی کے اندر مبتلا ہے۔ پہلا کام تو تم یہ کرو کہ یہ ہرگز مت سوچو کہ جب اتنا بڑا عالم یہ گناہ کا کام کر رہا ہے تو لاؤ میں بھی کر لوں، بلکہ تم اس عالم کی اس غلطی اور اس گناہ سے بچو اور اس کو دیکھ کر تم اس گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

گناہ کے کاموں میں علماء کی اتباع مت کرو

اس حدیث کے پہلے جملے میں ان لوگوں کی اصلاح فرمادی، جن لوگوں کو

(۱) رياضة المتعلمين لابن السنى ص ٢٣٤ (٢٣٦) مكتبة نظام يعقوبى، والسنن الكبرى للبيهقى ٣٥٦/١٠ (٢٠٩١٧). وقال الذهبى فى "المهذب" ٤٢٢٢/٨ (١٦١٤٦): قلت: كثير واه. طبع دار الوطن.

جب کسی گناہ سے روکا جاتا ہے اور منع کیا جاتا ہے کہ فلاں کام ناجائز اور گناہ ہے، یہ کام مت کرو۔ تو وہ لوگ بات ماننے اور سننے کے بجائے فوراً مثالیں دینا شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں عالم بھی تو یہ کام کرتے ہیں، فلاں عالم نے فلاں وقت میں یہ کام کیا تھا...... حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قدم پر ہی اس استدلال کی جڑ کاٹ دی کہ تمہیں اس عالم کی غلطی کی پیروی نہیں کرنی ہے، بلکہ تمہیں اس کی صرف اچھائی کی پیروی کرنی ہے، وہ اگر گناہ کا کام یا کوئی غلط کام کر رہا ہے تو تمہارے دل میں یہ جرأت پیدا نہ ہو کہ جب وہ عالم یہ کام کر رہا ہے تو ہم بھی یہ کریں گے۔ ذرا سوچو کہ اگر وہ عالم جہنم کے راستے پر جا رہا ہے تو کیا تم بھی اس کے پیچھے جہنم کے راستے پر جاؤ گے؟ وہ اگر آگ میں کود رہا ہے تو کیا تم بھی کود جاؤ گے؟ ظاہر ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے، پھر کیا وجہ ہے کہ گناہ کے کام میں تم اس کی اتباع کر رہے ہو؟

عالم کا عمل معتبر ہونا ضروری نہیں

اس وجہ سے علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ وہ عالم جو سچا اور صحیح معنی میں عالم ہو، اس کا فتویٰ تو معتبر ہے، اس کا زبان سے بتایا ہوا مسئلہ تو معتبر ہے، اس کا عمل معتبر ہونا ضروری نہیں۔ اگر وہ کوئی غلط کام کر رہا ہے تو اس سے پوچھو کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ وہ عالم یہی جواب دے گا کہ یہ عمل جائز نہیں، اس لیے تم اس کے بتائے ہوئے مسئلے کی اتباع کرو، اس کے عمل کی اتباع مت کرو، لہٰذا یہ کہنا کہ فلاں کام جب اتنے بڑے بڑے علماء کر رہے ہیں تو لاؤ میں بھی یہ کام کرلوں، یہ استدلال درست نہیں، اس کی مثال تو ایسی ہے، جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ آگ میں کود رہے ہیں، لاؤ میں بھی آگ میں کود

جاؤں۔ جیسے یہ طرزِ استدلال غلط ہے، اسی طرح وہ طرزِ استدلال بھی غلط ہے، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی لغزش کی اتباع مت کرو۔

عالم سے بدگمان نہ ہونا چاہیے

بعض لوگ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ جب وہ کسی عالم کو کسی غلطی میں یا گناہ میں مبتلا دیکھتے ہیں تو بس فوراً اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور اس سے بدگمان ہو بیٹھ جاتے ہیں اور بعض اوقات اس کو بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ مولوی ایسے ہی ہوتے ہیں اور پھر تمام علمائے کرام کی توہین شروع کر دیتے ہیں کہ آج کل کے علماء تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسی حدیث کے دوسرے جملے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ کی تردید فرما دی کہ اگر کوئی عالم گناہ کا کام کر رہا ہے تو اس کی وجہ سے اس سے قطع تعلق مت کرو، کیوں؟

علماء تمہاری طرح کے انسان ہی ہیں

اس لیے کہ علماء بھی تمہاری طرح کے انسان ہیں، جو گوشت پوست تمہارے پاس ہے، وہ ان کے پاس بھی ہے، وہ کوئی آسمان سے اترے ہوئے فرشتے نہیں ہیں، جو جذبات تمہارے دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ جذبات ان کے دل میں بھی پیدا ہوتے ہیں، نفس تمہارے پاس بھی ہے، ان کے پاس بھی ہے، شیطان تمہارے پیچھے بھی لگا ہوا ہے، ان کے پیچھے بھی لگا ہوا ہے، نہ وہ گناہوں سے معصوم ہیں، نہ وہ پیغمبر ہیں اور نہ وہ فرشتے ہیں، بلکہ وہ بھی اسی دنیا کے باشندے ہیں اور جن حالات سے تم گزرتے ہو، وہ بھی ان حالات سے گزرتے ہیں، لہٰذا یہ تم نے کہاں سے سمجھ لیا کہ وہ گناہوں سے معصوم ہیں اور ان

سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا اور ان سے کبھی غلطی نہیں ہوگی، اس لیے کہ جب وہ انسان ہیں تو بشری تقاضے سے کبھی ان سے غلطی بھی ہوگی، کبھی وہ گناہ بھی کریں گے، لہٰذا اس کے گناہ کرنے کی وجہ سے فوراً علماء سے برگشتہ ہوجانا اور ان کی طرف سے بدگمان ہوجانا صحیح نہیں، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ فوراً اس سے قطع تعلق مت کرو، بلکہ اس کے واپس آنے کا انتظار کرو، اس لیے کہ اس کے پاس علم صحیح موجود ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ کسی وقت لوٹ آئے گا۔

علماء کے حق میں دعا کرو

اور اگر اس کے لیے دعا کرو کہ یا اللہ! فلاں شخص آپ کے دین کا حامل ہے، اس کے ذریعے ہمیں دین کا علم معلوم ہوتا ہے، یہ بے چارہ اس گناہ کی مصیبت میں پھنس گیا ہے، اے اللہ! اس کو اپنی رحمت سے اس مصیبت سے نکال دیجیے۔ اس دعا کے کرنے سے تمہارا ڈبل فائدہ ہے: ایک دعا کرنے کا ثواب ملے گا، دوسرے ایک مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے کا ثواب اور اگر تمہاری یہ دعا قبول ہوگئی تو تم اس عالم کی اصلاح کا سبب بن جاؤ گے، پھر اس کے نتیجے میں وہ عالم جتنے نیک کام کرے گا وہ سب تمہارے اعمال نامہ میں بھی لکھے جائیں گے، لہٰذا بلا وجہ دوسروں سے یہ کہہ کر کسی عالم کو بدنام کرنا کہ فلاں بڑے عالم بنے پھرتے ہیں، وہ تو یہ حرکت کر رہے تھے، اس سے کچھ حاصل نہیں، اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

عالم بے عمل بھی قابلِ احترام ہے

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

ہیں کہ عالم کو تو خود چاہیے کہ وہ باعمل ہو، لیکن اگر کوئی عالم بے عمل بھی ہے تو بھی وہ عالم اپنے علم کی وجہ سے تمہارے لیے قابلِ احترام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم دیا ہے، اس کا ایک مرتبہ ہے، اس مرتبہ کی وجہ سے وہ عالم قابلِ احترام بن گیا، جیسا کہ والدین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (۱)

اگر والدین کافر اور مشرک بھی ہوں تو کفر اور شرک میں تو ان کی بات مت مانو، لیکن دنیا کے اندر ان کے ساتھ نیک سلوک کرو، اس لیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماں باپ ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ بذاتِ خود قابلِ تکریم اور قابلِ تعظیم ہیں، تمہارے لیے ان کی اہانت جائز نہیں۔ اسی طرح اگر ایک عالم بے عمل بھی ہے تو اس کے حق میں دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو نیک عمل کی توفیق دے دے، لیکن اس کی بدعملی کی وجہ سے اس کی توہین مت کرو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے کہ نرا علم کوئی چیز نہیں ہوتی، جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو، لیکن یہ بھی فرماتے کہ میرا معمول یہ ہے کہ جب میرے پاس کوئی عالم آتا ہے تو اگرچہ اس کے بارے میں مجھے معلوم ہو کہ یہ فلاں غلطی کے اندر مبتلا ہے، اس کے باوجود اس کے علم کی وجہ سے اس کا اکرام کرتا ہوں اور اس کی عزت کرتا ہوں۔

علماء سے تعلق قائم رکھو

لہٰذا یہ پروپیگنڈا کرنا اور علماء کو بدنام کرتے پھرنا کہ ارے میاں! آج کل

(۱) سورۃ لقمان آیت (۱۵).

کے مولوی سب ایسے ہی ہوتے ہیں، آج کل کے علماء کا تو یہ حال ہے...... یہ بھی موجودہ دور کا ایک فیشن بن گیا ہے۔ جو لوگ بے دین ہیں، ان کا تو یہ طرزِ عمل ہے ہی، اس لیے کہ ان کو معلوم ہے کہ جب تک مولوی اور علماء کو بدنام نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم اس قوم کو گمراہ نہیں کرسکتے، جب علماء سے اس کا رشتہ توڑ دیں گے تو پھر یہ لوگ ہمارے رحم و کرم پر ہوں گے، ہم جس طرح چاہیں گے، ان کو گمراہ کرتے پھریں گے۔ میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب گلّہ بان سے بکریوں کا رشتہ توڑ دیا تو اب بھیڑیے کے لیے آزادی ہوگئی کہ وہ جس طرح چاہے بکریوں کو پھاڑ کھائے، لہٰذا جو لوگ بے دین ہیں، ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ علماء کو بدنام کیا جائے، لیکن جو لوگ دیندار ہیں، ان کا بھی فیشن بنتا جارہا ہے کہ وہ بھی ہر وقت علماء کی توہین اور ان کی بے وقعتی کرتے پھرتے ہیں کہ ارے صاحب! علماء کا تو یہ حال ہے۔ ان لوگوں کی مجلسیں ان باتوں سے بھری ہوتی ہیں، حالانکہ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں، سوائے اس کے کہ جب لوگوں کو علماء سے بدظن کردیا تو اب تمہیں شریعت کے احکام کون بتائے گا؟ اب تو شیطان ہی تمہیں شریعت کے مسائل بتائے گا کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، پھر تم اس کے پیچھے چلو گے اور گمراہ ہوجاؤ گے، لہٰذا علماء اگرچہ بے عمل نظر آئیں، پھر بھی ان کی اس طرح توہین مت کیا کرو، بلکہ ان کے لیے دعا کرو۔ جب تم اس کے حق میں دعا کرو گے تو علم تو اس کے پاس موجود ہے، تمہاری دعا کی برکت سے ان شاء اللہ ایک دن وہ ضرور صحیح راستے پر لوٹ آئے گا۔

ایک ڈاکو پیر بن گیا

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اپنے مریدین سے فرمانے

لگے تم کہاں میرے پیچھے لگ گئے، میرا حال تو اس پیر جیسا ہے جو حقیقت میں ایک ڈاکو تھا، اس ڈاکو نے جب یہ دیکھا کہ لوگ بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ پیروں کے پاس جاتے ہیں، ان کے پاس ہدیے، تحفے لے جاتے ہیں، ان کا ہاتھ چومتے ہیں، یہ تو اچھا پیشہ ہے، میں خواہ مخواہ راتوں کو جاگ کر ڈاکے ڈالتا ہوں، پکڑے جانے اور جیل میں بند ہونے کا خطرہ الگ ہوتا ہے، مشقت اور تکلیف علیحدہ ہوتی ہے، اس سے اچھا یہ ہے کہ میں پیر بن کر بیٹھ جاؤں، لوگ میرے پاس آئیں گے، میرے ہاتھ چومیں گے، میرے پاس ہدیے، تحفے لائیں گے، چنانچہ یہ سوچ کر اس نے ڈاکہ ڈالنا چھوڑ دیا اور ایک خانقاہ بنا کر بیٹھ گیا، لمبی تسبیح لے لی، لمبا کرتہ پہن لیا اور پیروں جیسا حلیہ بنالیا اور ذکر اور تسبیح شروع کردی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ کوئی اللہ والا بیٹھا ہے اور بہت بڑا پیر معلوم ہوتا ہے، تو لوگ اس کے مرید بننا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ مریدوں کی بہت بڑی تعداد ہوگئی، کوئی ہدیہ لا رہا ہے، کوئی تحفہ لا رہا ہے، خوب نذرانے آرہے ہیں، کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی پاؤں چوم رہا ہے، ہر مرید کو مخصوص ذکر بتادیے کہ تم فلاں ذکر کرو، تم فلاں ذکر کرو، اب ذکر کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کے درجات بلند فرماتے ہیں، چونکہ ان مریدوں نے اخلاص کے ساتھ ذکر کیا تھا، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درجات بہت بلند فرمادیے اور کشف و کرامات کا اونچا مقام حاصل ہوگیا۔

مریدین کی دعا کام آئی

ایک روز مریدین نے آپس میں گفتگو کی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تو اس مرتبہ تک پہنچا دیا، ہم ذرا یہ دیکھیں کہ ہمارا شیخ کس مرتبے کا ہے؟ چنانچہ انہوں نے

مراقبہ کر کے کشف کے ذریعے اپنے شیخ کا مرتبہ معلوم کرنا چاہا، لیکن جب مراقبہ کیا تو شیخ کا درجہ کہیں نظر ہی نہیں آیا، آپس میں مریدین نے مشورہ کیا کہ شاید ہمارا شیخ اتنے اونچے مقام تک پہنچا ہوا ہے کہ ہمیں اس کی ہوا تک نہیں لگی، آخر کار جا کر شیخ سے ذکر کیا کہ حضرت! ہم نے آپ کا مقام تلاش کرنا چاہا، مگر آپ تو اتنے اونچے مقام پر ہیں کہ ہم وہاں تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس وقت شیخ نے اپنی حقیقت ظاہر کر دی اور روتے ہوئے اس نے کہا کہ میں تمہیں اپنا درجہ کیا بتاؤں، میں تو اصل میں ایک ڈاکو ہوں اور میں نے دنیا کمانے کی خاطر یہ سارا دھندا کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ذکر کی بدولت تمہیں اونچے اونچے مقام عطا فرما دیے اور میں تو اسفل السافلین میں ہوں، تمہیں میرا مرتبہ کہاں ملے گا؟ میں تو ڈاکو اور چور ہوں، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے میرے پاس سے بھاگ جاؤ اور کسی دوسرے پیر کو تلاش کرو، جب شیخ کے بارے میں یہ باتیں سنیں تو ان سب مریدوں نے آپس میں مل کر اپنے شیخ کے لیے دعا کی کہ یا اللہ! یہ چور ہو یا ڈاکو ہو، لیکن یا اللہ! آپ نے ہمیں جو کچھ عطا فرمایا ہے، وہ اسی کے ذریعے عطا فرمایا ہے، اے اللہ! اب آپ اس کی بھی اصلاح فرما دیجیے اور اس کا درجہ بھی بلند کر دیجیے، چونکہ وہ مریدین مخلص تھے اور اللہ والے تھے، ان کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی بخش دیا اور اس کو بھی بلند درجہ عطا فرما دیا۔

بہر حال! کبھی کسی عالم کے بارے میں کوئی غلط بات سنو تو اس کو بدنام کرنے کے بجائے اس کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔
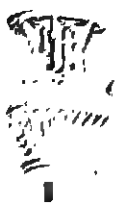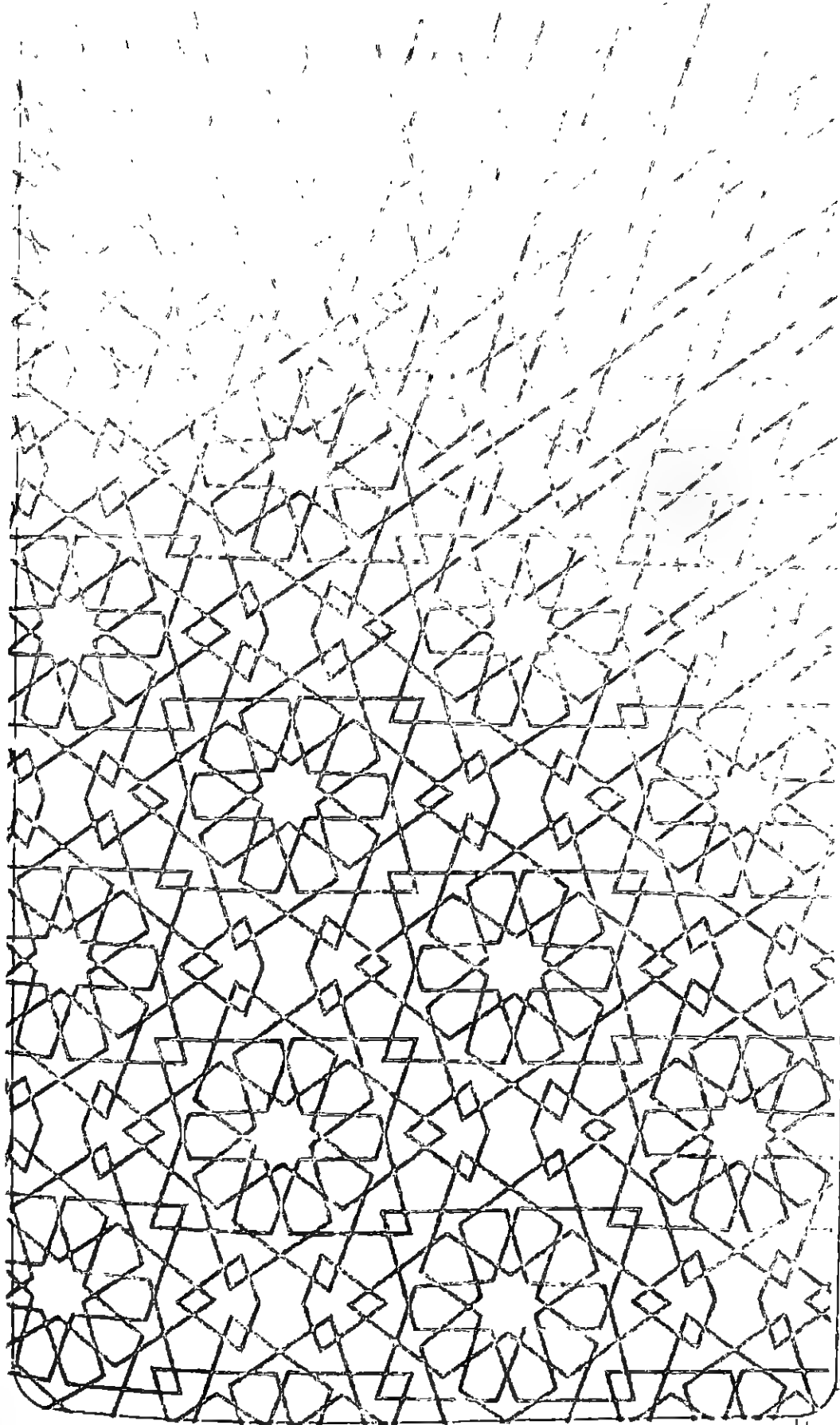
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علم پر عمل کریں
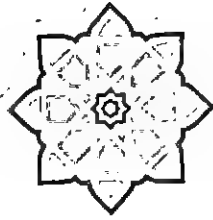
(اصلاحی مواعظ ۲/۲۰۱)
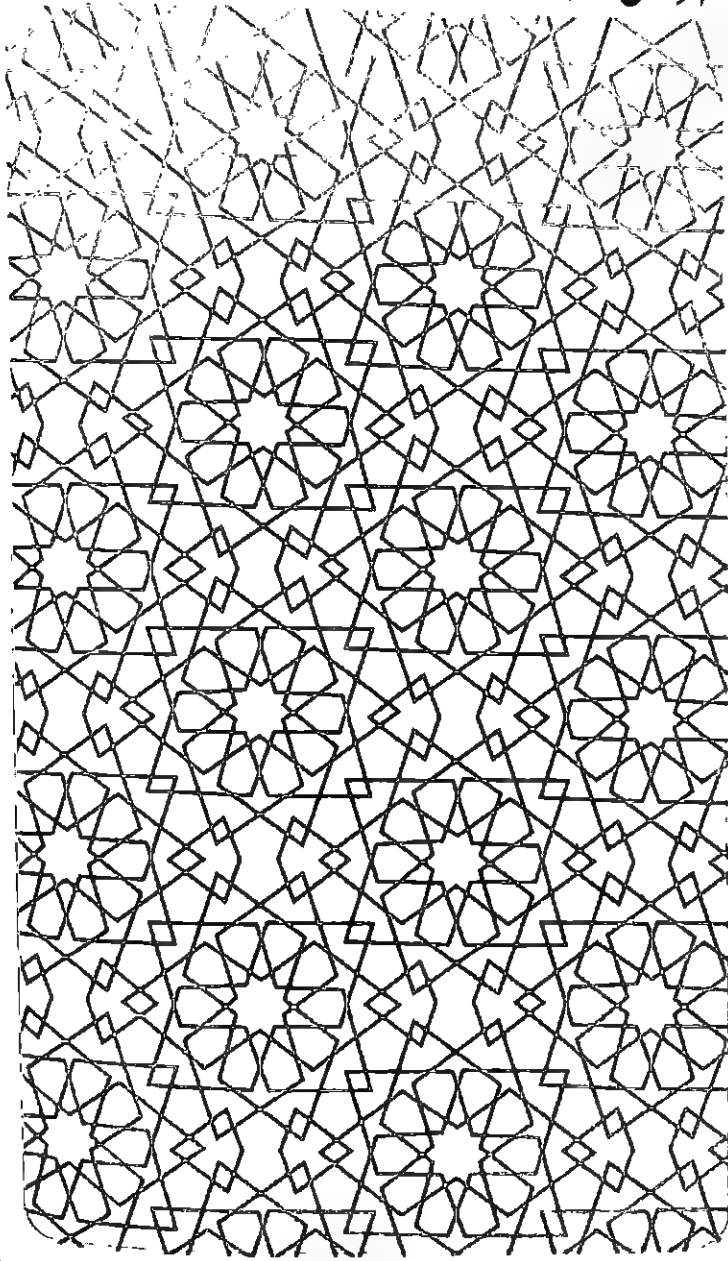
بسم اللہ الرحمن الرحیم

علم پر عمل کریں

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (۱)

بزرگوں کا فیض

بزرگانِ محترم، برادرانِ عزیز!

اس وقت آپ کے مدرسے میں حاضری سے اصل مقصد یہ تھا کہ اپنے بزرگوں اور احباب سے ملاقات ہوجائے، لیکن محترم برادرم مولانا محمد حنیف صاحب مدظلہ نے فرمایا چند گزارشات پیش کروں اور طلبہ کو کچھ نصیحتیں کروں۔

(۱) سورۃ المائدۃ آیت (۱۰۵)،

میں نے ان سے کہا نصیحت کے مفید ہونے اور مؤثر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ نصیحت کرنے والا، جن کو نصیحت کی جارہی ہے، ان سے مرتبے میں بلند ہو۔ ان بزرگوں کے سامنے مجھ جیسا حقیر کیا نصیحت کرے، لیکن اپنی طالبِ علم برادری میں ایک بات مشہور ہے اور وہ تکرار ہے، یعنی اساتذہ اور بزرگوں سے جو بات سنی ہو، اس کو اپنے ساتھیوں کے سامنے سنادیں، یہ تکرار ہے، تو میں نے سوچا کہ تھوڑا تکرار ہوجائے، تاکہ دونوں کو فائدہ ہوجائے، اللہ تعالیٰ ہماری اس نیت کو قبول فرمائے، آمین۔

جو کچھ عرض کروں گا، اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی کروں گا۔ اپنے پلے تو کوئی چیز ہی نہیں۔ ایک آیتِ کریمہ ذہن میں آگئی ہے، اس کے بارے میں بزرگوں سے سنا ہے، اس کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ صحیح بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

عالمی پریشانی کا علاج

حقیقت یہ ہے کہ اگر غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ آیت کریمہ ہمارے موجودہ دور کی تمام پریشانیوں کا واحد علاج ہے۔ ایک سوال جو اکثر وبیشتر ہمارے ذہنوں میں بھی پیدا ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی پوچھتے ہیں، وہ یہ کہ عالمِ اسلام انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک کا پھیلا ہوا خطہ زمین جس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح جوڑا ہوا ہے کہ آپ دنیا کے نقشے پر نظر ڈال کر دیکھیں تو رباط سے لے کر جکارتہ تک ایک زنجیر ہے، جس میں اسرائیل جیسی صرف ایک آدھ اجنبی دیوار حائل ہے، اس کے سوا مسلمان ممالک میں کوئی فاصلہ نہیں اور اگر تعداد کے

اعتبار سے دیکھیں تو جتنی تعداد آج مسلمانوں کی ہے، اتنی کبھی نہیں ہوئی اور جتنے وسائل (مالی اعتبار سے، قدرتی وسائل کے اعتبار سے اور علم وہنر کے اعتبار سے) آج مسلمانوں کے پاس ہیں، تاریخ میں کبھی مہیا نہیں ہوئے اور دنیا کی اہم ترین شاہراہیں، مثلاً نہر سوئیز وغیرہ تمام مسلمانوں کے قبضے میں ہیں، اگر غیر مسلموں کے لیے ان کو بند کردیا جائے تو ان کا عرصۂ حیات تنگ ہوجائے۔ امریکہ ہو یا برطانیہ دنیا میں سب سے زیادہ تیل مسلم ممالک میں پیدا ہوتا ہے، جس کو آج کی اصطلاح میں زرِ سیال کہا جاتا ہے، اتنا تیل پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی میں یہ مقولہ مشہور ہوگیا ہے کہ جہاں مسلمان ہیں، وہاں تیل ہے۔ اس کے باوجود ہر جگہ پٹائی بھی مسلمان ہی کی ہورہی ہے اور ذلیل بھی دنیا میں یہی ہورہا ہے۔ دیکھیں! بوسنیا میں کیا ہورہا ہے؟ کشمیر ہو یا صومالیہ، الجزائر ہو یا تیونس، سب جگہ مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔

صرف جماعتیں کافی نہیں

دوسری طرف دیکھیں کہ کتنی تنظیمیں اور جماعتیں اصلاحِ حال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ پورے عالمِ اسلام میں انڈونیشیا سے لے کر الجزائر تک اور اس کے علاوہ پاکستان میں ہی دیکھ لیجیے کہ اگر جماعتوں کا سروے کیا جائے تو یقیناً لاکھوں میں ہوں گی، گلی گلی میں جماعت بنی ہوئی ہے اور کوئی علاقہ خالی نہیں۔ اغراض ومقاصد دیکھو تو دنیا بھر کی جو اچھائیاں تصور میں آسکتی ہیں درج ہوں گی۔ کچھ جماعتیں تو ایسی ہیں جن کا نام صرف لیٹر پیڈ پر ہے، ان کے علاوہ کچھ کام بھی کررہی ہیں، لیکن جو برائی کا سیلاب روز بروز بڑھ رہا ہے، اس میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اب اسی مدرسے کی چار دیواری میں دیکھیں کہ کیا حال

ہے؟ اور اس سے دس قدم باہر دیکھیں کیا منظر نظر آتا ہے؟ یعنی جو معاشرہ بدی کی طرف جارہا ہے، اس میں ذرہ برابر کمی نظر نہیں آتی اور دوسری طرف تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ایک مجلس میں ہزاروں آدمیوں نے توبہ کی اور شرک وبدعت سے توبہ کی۔[1] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری یہ ساری کوششیں کیوں رائیگاں اور بے فائدہ ہورہی ہیں؟ یادرکھیں! ان کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب کا بیان اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

اصلاحِ نفس مقدم ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۗ (۲)

''اے ایمان والو! اپنی اصلاح کی فکر کرو، اگر تم ہدایت پر آجاؤ تو جو لوگ گمراہ ہو گئے ہیں، ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں دے گی۔''

ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرے، کیونکہ معاشرہ نام ہے افراد کا۔ اگر ہر فرد اپنی اصلاح کرلے تو معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم لوگوں کو یہاں سے غلطی لگ جاتی ہے کہ ہمیں جب بھی اصلاح کا خیال آتا ہے تو اس طرح کہ آغاز دوسروں سے ہو۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ مجھے اصلاح کی ضرورت نہیں، بلکہ میں نے تو اصلاحِ خلق کا فریضہ انجام دینا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

---

(۱) لفتة الكبد إلى نصيحة الولد لابن الجوزی ص ۳۷، طبع مكتبة الإمام البخاری.
(۲) سورة المائدة آیت (۱۰۵).

ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا آدمی جب اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے تو شور مچا کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی آواز ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہے اور دوسری طرف جو اپنی اصلاح کر کے بات کرتا ہے تو اس کی بات صرف کان سے ٹکرا کر واپس نہیں آتی، بلکہ سیدھی کان کے راستے دل میں اتر جاتی ہے۔ اب ہمارا حال یہ ہے کہ ساری برائیاں جو معاشرے میں ہیں، سب کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ان برائیوں میں سے میرے اندر بھی کوئی برائی پائی جاتی ہے کہ نہیں، دوسروں کی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا تو کم از کم اپنی برائی کو دور تو کر سکتا ہوں، اس طرف ذہن نہیں جاتا۔ اسی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُم"[1]

جو شخص یہ کہے کہ دنیا ہلاک ہوگئی وہ خود تباہ ہوا۔

اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو صاف سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح کی فکر کیے بغیر ساری دنیا کو گمراہ سمجھتا ہے۔ یاد رکھیں! اگر اصلاح کی فکر اللہ پاک ہمارے دل میں پیدا کر دے تو دوسروں کے عیب بھی اپنے عیبوں کے سامنے بے حقیقت معلوم ہوں گے، پھر اس صورت میں انسان کے منہ سے جو بات نکلتی ہے، وہ دل سے نکلتی ہے اور وہ اللہ کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہماری دعوت و تبلیغ اس لیے برگ و بار نہیں لا رہی کہ ہم نے اپنی اصلاح کی فکر چھوڑ دی ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ ہم نور الایضاح سے لے کر صحیح بخاری تک فقہ و حدیث کی تمام کتب پڑھتے ہیں، بتائیں کتنے پر عمل ہو رہا ہے؟

---

(۱) صحیح مسلم ٤/٢٠٢٤(٢٦٢٣).

اپنا احتساب کریں

میرے والدِ محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تاجر برادری سال میں ایک دن اپنی تجارت بند کرتی ہے، تاکہ سال بھر کی تجارت کا حساب کتاب کریں اور معلوم کریں کتنی آمدنی ہوئی اور کتنا خرچ ہوا۔ اسی طرح ہمیں بھی حساب کرنا چاہیے کہ سال بھر کتنا پڑھا اور کتنے پر عمل کیا اور کیا تبدیلی آئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ

"جَاءَ حِمَارٌ صَغِيرٌ وَرَجَعَ حِمَارٌ كَبِيرٌ"

''چھوٹا گدھا آیا تھا اور بڑا گدھا بن کر چلا گیا''

علم سے مقصود عمل ہے

حضرت ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے امام، متقی اور بڑے صوفی عالم تھے، فرماتے ہیں کہ جب کوئی حدیث سنو تو کسی نہ کسی وقت اس پر عمل کرلو۔

"وَلَا تَكُنْ هَمَّكَ أَنْ تُحَدِّثَ بِهِ النَّاسَ"(۱)

اور ایسا نہ ہو کہ کوئی بات معلوم ہو، لیکن سوچا کہ کسی تقریر میں سنائیں گے یا کسی مجمع میں سنائیں گے۔

ہمارے حضراتِ اکابر علماءِ دیوبند کی خصوصیت کیا ہے؟ اور دارالعلوم کا کیا امتیاز تھا؟ دنیا میں بڑے بڑے تحقیقی ادارے ہیں، جن کا پہلے ہم نام سنتے تھے

(۱) المدخل إلى السنن الكبرى للبيهقي ص۳۲۹ (۵۲۷) طبع دار الخلفاء الكويت۔ وجامع بيان العلم وفضله لابن عبدالبر ۷۰۸/۱ (۱۲۷۹) طبع دار ابن الجوزي۔

اور اب اللہ تعالیٰ نے وہ مجھے دکھادیے ہیں، واقعتہً علم وہنر کے اعتبار سے اعلیٰ سے اعلیٰ ادارے نظر آئیں گے۔ عالمِ اسلام کو چھوڑیے، مغربی ملکوں میں مستشرقین بیٹھے ہیں جو اسلام کے متعلق کتابیں لکھ رہے ہیں اور ان میں ایسی ایسی اہم کتب کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان کے نام تک آپ نے نہیں سنے ہوں گے، لیکن یہ سارے علوم محض علم دانستن کے معنی میں بے حقیقت و بے روح ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی یہ خصوصیت ہے کہ علم و تحقیق کے ساتھ اس کا ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ جو علم میں حاصل کروں، وہ میری زندگی میں رچ بس جائے۔

دارالعلوم دیوبند کا امتیاز

میرے دادا مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے پرانے حضرات میں سے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے دارالعلوم کا ایسا زمانہ بھی دیکھا ہے جس میں شیخ الحدیث سے لے کر ایک ادنیٰ دربان تک ہر شخص ولی اللہ تھا۔ اس دور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

"درمدرسہ خانقاہ دیدم"

رات کو اساتذہ یا طلبہ کے کمروں میں جاؤ تو معلوم ہوتا کہ عبادت گزار اور زاہد جمع ہیں اور دن کو جاؤ تو "قال اللہ و قال الرسول" کی آوازیں گونج رہی ہیں۔

احتیاط اسے کہتے ہیں

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آپ بیتی میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ کے چندہ کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور وہاں تین

سو روپے چندہ ہوا۔ اُس زمانے کے تین سو روپے اِس زمانہ کے تین لاکھ سے کم نہیں تھے۔ راستے میں کسی ظالم نے چوری کر لیے تو مولانا بڑے پریشان ہوئے اور اپنا سارا اثاثہ مدرسہ میں فروخت کر کے تاوان ادا کرنے کے لیے رقم اکٹھی کی، جب لوگوں نے دیکھا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سارا اثاثہ مدرسہ میں داخل کرا کے فقر وفاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے، حالانکہ یہ امانت تھی اور ان سے کوئی تعدّی نہیں ہوئی، لہٰذا شرعاً ان پر کوئی تاوان واجب نہیں تھا، تو لوگوں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس بارے میں خط لکھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے پاس خط لکھا کہ آپ سے کوئی قصور نہیں ہوا، لہٰذا شرعاً آپ پر کوئی تاوان نہیں آتا، جب یہ خط آیا تو مولانا نے فرمایا کہ واہ واہ! حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری فقہ میرے لیے پڑھی تھی۔ اس کے آگے جو بات فرمائی، وہ ان ہی کے مقام کی بات ہے۔ فرمایا کہ حضرت گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسئلہ تو آپ نے بتا دیا ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں اگر آپ کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تو آپ کیا کرتے؟ یعنی ان کو یہ یقین تھا کہ اگر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا تو وہ بھی تاوان دیے بغیر چین سے ہرگز نہ بیٹھتے۔ یہ تھے علمائے دیوبند، جن کی طرف ہم اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ نہیں، بلکہ ان حضرات کی پوری زندگی کا ایک ایک عمل، ایک ایک حرکت دین میں رچی بسی ہوئی تھی۔

ہم دردی اور ایثار

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے اور حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ میرے والد صاحب فرماتے تھے کہ

"ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ کچا مکان بنا ہوا ہے اور جب بارش آتی ہے تو وہ گرجاتا ہے اور حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کوئی چیز بنواتے ہیں اور کبھی کوئی، میں نے عرض کیا حضرت! آپ ایک بار اس کو پکا کیوں نہیں بنا لیتے؟ تو حضرت نے کہا: "واہ! محمد شفیع تم نے تو عقل کی بات کی ہے، ہم تو بوڑھے ہوگئے ہیں اور ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی"، میں نے عرض کیا: "حضرت! آپ ناراض ہوگئے ہیں، مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، معاف فرمادیں"، پھر حضرت مجھے ساتھ لے کر دروازہ سے باہر نکل گئے اور فرمایا: "دیکھو! اس گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کوئی مکان پکا ہے؟ جب میرے پڑوس میں کوئی مکان پکا نہ ہو تو میں کیسے پکا مکان بنالوں"؟

ہمارے علمائے دیوبند کا یہ ایک واقعہ نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان میں سے ہر ہر فرد کو ایک الگ صفت عطا فرمائی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ بزرگوں کے حالات ضرور پڑھا کریں، کیونکہ علم برائے علم کوئی چیز نہیں، لہٰذا علم کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیے کہ جن کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ان کی کتابوں کے پڑھنے سے محروم رہتا ہوں، اس لیے کہ

تھوڑی دیر تک سمجھ آتی ہے، لیکن جب وہ ملاء اعلیٰ تک پہنچ جاتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جو میری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں تو بغیر تکلم کے سمجھ میں نہیں آتی اور تکلم کا عادی نہیں۔ غرض حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے جو درس نظامی کے فاضل بھی نہیں تھے اور ان کے پاس جا کر عرض کیا کہ حضرت! ہماری اصلاح کریں۔

دوسری طرف حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم بھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اصلاح کے لیے چلے گئے۔ ان دونوں سے کسی نے پوچھا کہ آپ حاجی صاحب کے پاس گئے ہیں جو پورے عالم بھی نہیں ہیں، حالانکہ ان کو چاہیے تھا کہ آپ کے پاس آتے، تو ان دونوں نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص وہ ہے جس نے گلاب جامن کھائی تو نہیں، لیکن اس کو گلاب جامن کی پوری تاریخ یاد ہو کہ فلاں ملک میں بنتی ہے، فلاں چیز سے بنتی ہے۔ اگر اس کو کہو کہ اس پر مقالہ لکھ دیں تو وہ مقالہ لکھ دے گا اور ایک وہ ہے جس کو گلاب جامن کی تاریخ تو نہیں آتی، لیکن کھاتا روز ہے، ان میں سے کون بہتر ہے؟ ظاہر ہے کہ وہی بہتر ہے جس نے گلاب جامن کھائی ہو، تو ہماری مثال ایسی ہے کہ جو علوم پڑھ رہے تھے، وہ لفظی تھے اور حروف ونقوش تھے اور جب ان کی خدمت میں گئے تو وہ حروف ونقوش روح بن گئے۔

اللہ والوں کے پاس کیا ملتا ہے؟

یہ حاصل ہوتا ہے اللہ والوں کے پاس جانے سے پتا نہیں لوگوں نے تصوف میں کیا کیا بدعات وخرافات داخل کر دی ہیں اور مفروضے قائم کر لیے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ کسی اللہ والے کے پاس جا کر اپنے دل ونفس اور

باطن کی اصلاح کرائیں۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تک کوئی فرد ایسا نہیں جس نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی اللہ والے سے اپنی اصلاح نہ کروائی ہو۔ آج کل یہ چیزیں ہمارے ماحول میں اجنبی ہوگئی ہیں، جو کوئی کرے تو کہتے ہیں صوفی ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی بجائے دل میں دنیا کی محبت، حبِ جاہ، حبِ مال، شہرت بھری ہوئی ہے اور اسی وجہ سے کسی داعی کی دعوت کارآمد نہیں ہوتی۔ غرض ہماری ساری جدوجہد کی ناکامی کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی اصلاح کی فکر چھوڑ دی۔

قرآن پاک یہ کہتا ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ [1]

اے ایمان والو! اپنی اصلاح کی فکر کرلو تو گمراہ ہونے والوں کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے۔

تو جس دن ہم نے یہ فکر کرلی تو اپنی عاقبت بھی درست کرلیں گے اور دنیا کی جدوجہد میں بھی برکت ہوگی۔ اور اگر ہم نے اپنی اصلاح کی کوشش نہ کی تو یاد رکھیں! ہمارا پڑھنا، پڑھانا، دعوت وتبلیغ سب اکارت جائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور دین پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۱) سورۃ المائدۃ آیت (۱۰۵).
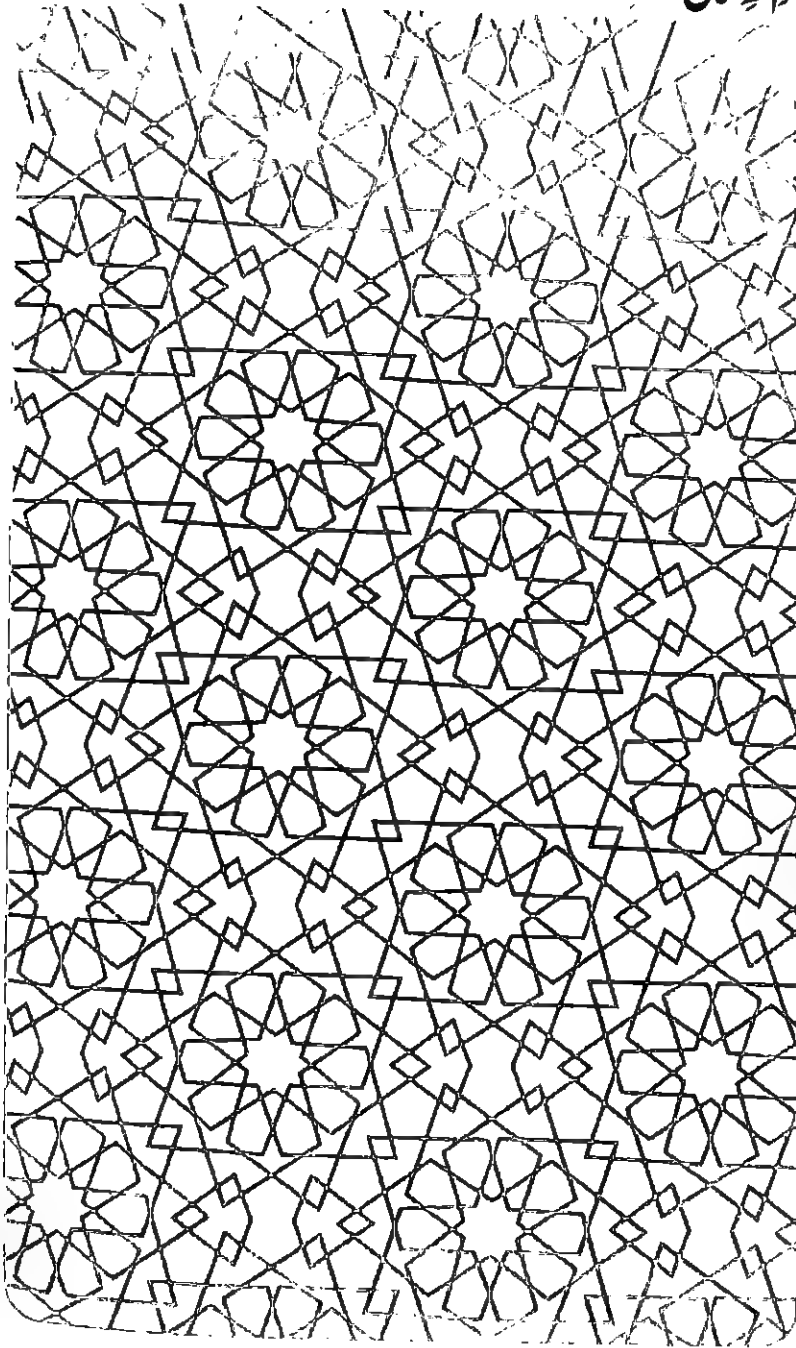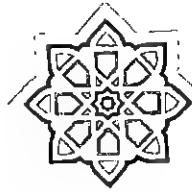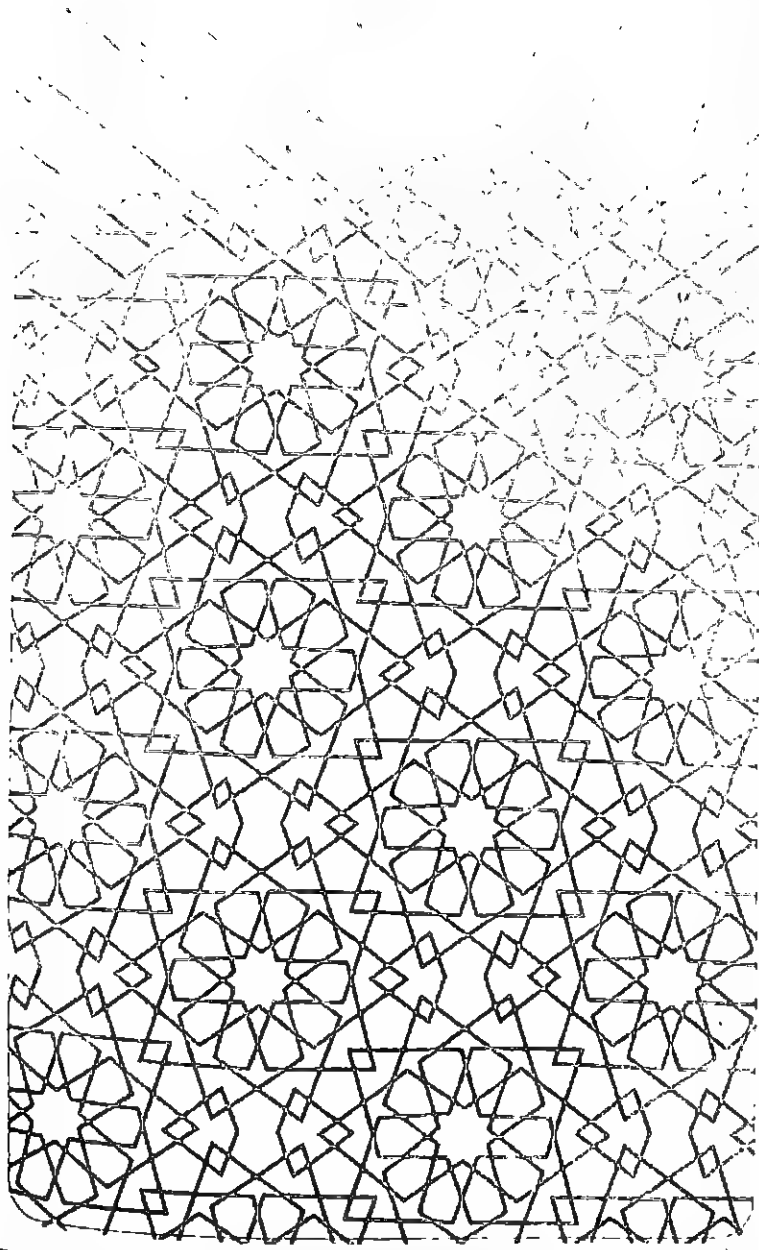
علم نے پکارا عمل کو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علم نے پکارا عمل کو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا،

اما بعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اسی کی توفیق سے اتوار کے دن ہم لوگ یہاں جمع ہوجایا کرتے ہیں اور سالہا سال سے یہ معمول الحمدللہ چلا آتا ہے، بیچ میں میرے کسی سفر کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے یا کسی اور عارض کی وجہ

سے کبھی کبھی ناغہ ہوتا رہا، لیکن جب کوئی عوارض نہ ہوں تو الحمدللہ یہاں حاضری کی توفیق ہوجاتی ہے، آپس میں مل بیٹھتے ہیں، کچھ دین کی باتیں ہوجاتی ہیں۔شروع میں حدیث کی کوئی کتاب پڑھ لیا کرتے تھے، حدیث کی کچھ تشریح ہوجاتی تھی، کبھی ایک کتاب، کبھی دوسری کتاب پھر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں سے کچھ انتخاب بنیادی طور پر پڑھ لیتے تھے اور اس کی کچھ تشریح وتوضیح میں کرلیتا تھا۔سوال یہ ہے کہ یہ کیوں ہے؟ اس مجلس کا اور اس اجتماع کا، مل بیٹھنے کا مقصد کیا ہے؟اگر یہ کوئی رسمی اجتماع ہے، کوئی رسمی درس ہے، تو بہت کچھ ہوتے رہتے ہیں، رسمی اجتماعات بھی ہوتے ہیں، رسمی تقریب بھی ہوتے ہیں، رسمی تقریریں بھی ہوتی ہیں، بیانات بھی ہوتے ہیں،لیکن اس کا کیا مقصد ہے؟ یہاں دارالعلوم کے اندر الحمدللہ صبح سے شام تک قرآن وحدیث اوراسلامی علوم اور اسی کی درس وتدریس کا سلسلہ چل رہا ہے اور چھ گھنٹے روزانہ دین کے علوم کا درس ہوتا ہے اوربعض اوقات چھ گھنٹے سے بھی زیادہ، راتوں کوبھی سبق ہوتا ہے۔پھر یہ ہفتہ وار یہاں الگ سے جمع ہونے کا کیا حاصل؟ اس کا کیا مقصد؟اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ اس کوصحیح سمجھنے کی اور اس پرعمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

ہفتہ واری اصلاحی مجلس کا مقصد

بات دراصل یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے کسی چیز کا جاننا، پھر یہ بھی اپنی ذات میں بڑی اہم بات ہے کہ جب تک کسی انسان کوکسی چیز کاعلم نہ ہوپھرتو آگے وہ عمل کیسے کرے؟لیکن تنہاعلم کسی چیز کے لیے،کسی مقصد کو حاصل کرنے لیے کافی

نہیں ہوتا۔ فرض کرلو کہ ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں چیز ہماری صحت کے لیے فائدہ مند ہے، تو علم تو حاصل ہو گیا، لیکن محض علم حاصل ہوجانے سے صحت کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اگر فرض کرو کسی کو بخار ہو رہا ہے اور اس کو پتا چل گیا کہ بخار میں فلاں گولی فائدہ کرتی ہے، علم حاصل ہوگیا، تو محض اس علم کے حاصل ہونے سے بخار نہیں اترے گا، بخار اپنی جگہ رہے گا، بخار اس وقت اترے گا جب اس پر عمل کرے، یہ گولی میں کھالوں، یہ دوا میں استعمال کرلوں۔ جب عمل کرے گا تو پھر اس کا فائدہ حاصل ہوگا، تو ٹھیک ہے کہ اگر علم ہی نہ ہو کہ کاہے سے بخار اترے گا اور کس چیز سے مجھے فائدہ ہوگا، یہ پتا ہی نہ چلے تو وہ عمل کیسے کرے گا، لیکن علم کے بعد ضروری ہے کہ اس پر عمل ہو، اس کے بغیر تنہا علم بے کار ہے۔

علم عمل کو پکارتا ہے

بلکہ بزرگوں نے فرمایا کہ اگر علم پر عمل نہ ہو تو رفتہ رفتہ وہ علم بھی جاتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے والدِ ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقولہ نقل فرماتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کسی مقولے میں کہ علم اور عمل یہ دونوں بھائی بھائی ہیں، جب ان میں سے کوئی ایک آتا ہے، جیسے علم آتا ہے تو وہ اپنے دوسرے بھائی، یعنی عمل کو آواز دیتا ہے کہ تم بھی آجاؤ، تو اگر وہ آجائے تو ٹھیک، ورنہ یہ دوسرا بھائی علم بھی رخصت ہو جاتا ہے

"هَتَفَ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ، فَإِنْ أَجَابَهُ وَإِلَّا ارْتَحَلَ "(۱)

علم نے عمل کو پکارا کہ تم بھی آجاؤ، اگر عمل نے جواب دے دیا اور آگیا تو

(۱) ذم من لا يعمل بعلمه: ص ٣٨(١٤) طبع دار الفكر، اقتضاء العلم للخطيب ص٣٥(٤٠)، و معجم عبد الخالق: ص٣٥٣(٣٥٧) طبع دار البشائر.

ٹھیک، ورنہ وہ علم بھی رخصت ہوجاتا ہے۔ تو علم تنہا کافی نہیں، جب تک کہ اس پر عمل نہ ہو اور یہ علم دین کے مبادی سے لے کر دین کے اعلیٰ ترین احکام وتعلیمات پر سب کا یہی حال ہے۔ دین کا تھوڑا بہت علم تو ہر مسلمان کو ہوتا ہے، مسلمان کو پتا ہے کہ نماز پڑھنا فرض ہے، مسلمان کو پتا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنی چاہیے، مسلمان کو پتا ہے کہ جھوٹ بولنا حرام ہے، مسلمان کو پتا ہے کہ غیبت کرنا حرام ہے، مسلمان کو پتا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے، رشوت دینا حرام ہے، یہ سارے علم تو حاصل ہیں، ہر مسلمان کو حاصل ہے، کتنا ہی گیا گزرا مسلمان ہو، لیکن اتنا علم تو سب کو حاصل ہے۔

علم پر عمل کیوں نہیں؟

لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس علم پر عمل نہیں ہو پاتا؟ کیوں نہیں ہو پاتا، اس لیے کہ ہر انسان نے اپنی زندگی کا ایک ڈھب بنایا ہوا ہے، زندگی کا ایک طریقہ بنایا ہوا ہے، اس پر وہ چلا جارہا ہے یہ دیکھنے کی فرصت نہیں کہ میرے اس عمل میں اور اضافہ کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، اپنی کوتاہیاں دور کرنے کی ضرورت ہے، اپنے عیوب کے ازالے کی ضرورت ہے، یہ دیکھنے کی فرصت نہیں۔ صبح سے لے کر رات کو بستر میں جانے تک روٹین ہے جو چلی جارہی ہے، وہ اچھی ہو یا بری، جیسے بھی ہو، ہر آدمی اس میں گھرا ہوا ہے۔ تاجر ہے تو صبح کو اٹھتا ہے اور تجارت کے لیے نکلتا ہے، شام کو تھکا ہارا گھر پہ آتا ہے، جو کچھ معمولات ہیں اپنی زندگی کے کھانے پینے کے، گھر والوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے وہ پورے کرتا ہے، پھر سو جاتا ہے۔ ہم طالب علم لوگ ہیں تو ہمارا بھی یہ حال ہے، ایک ڈھب بنا رکھا ہے، صبح کو اٹھے، صبح سے لے کر شام تک وہی جو پرانا

ہے وہ کر کرا کے رات کو پھر بستر پر پہنچ گئے، سو گئے، یہ فکر کہ اس میں کچھ اضافہ ہو، یہ فکر کہ اس میں کچھ ترقی ہو، یہ فکر کہ اس میں جو کوتاہیاں ہیں وہ دور ہوں، یہ مصروفیت سمجھ میں نہیں آتی، بس ایک پہیہ ہے جو چل رہا ہے، ایک پہیہ ہے جس ڈھب پہ چل رہا ہے، بس چل رہا ہے، اصلاح کی فکر، ترقی کی فکر یہ ہمارے روزمرہ کے معمولات میں اس کی نوبت نہیں آتی۔

جس کے دو دن برابر ہو گئے وہ خسارے میں ہے

حالانکہ فرمایا گیا ہے کہ

"مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ". (1)

جس کے دو دن برابر ہو گئے وہ خسارے میں ہے۔

یعنی جیسا کل کا دن گزرا تھا، ویسا آج کا بھی گزرا، کوئی ترقی نہیں ہوئی، تو گھاٹا ہے۔ اور تاجروں کو دیکھو، وہ تجارت کرتے ہیں تو تجارت میں اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ یہ نہیں کہ بس اتنا نفع آیا اس کو لے کر رکھ دیا۔ تجارت میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ آج جتنا آیا، کل اس سے زیادہ آئے، پرسوں اس سے زیادہ آئے، ترسوں اس سے زیادہ آئے، ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے ہر آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ میری روزانہ کچھ نہ کچھ ترقی ہو، کچھ نہ کچھ اضافہ ہو، میرے اعمال میں اضافہ ہو، میرے اخلاق میں بہتری آئے، میرے گناہوں سے بچنے میں ترقی آئے، یہ ہونا چاہیے۔

---

(۱) حلية الاولياء ۳۵/۸ سمعت إبراهيم بن أدهم يقول: بلغني أن الحسن البصري، رأى النبي صلى الله عليه وسلم في منامه فقال: يا رسول الله عظني قال: مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَاهُ فهو مَغْبونٌ وَمَنْ كَانَ غَدُهُ شَرًّا مِنْ يَوْمِهِ فَهُوَ مَلْعُونٌ وَمَنْ لَمْ يَتَعَاهَدِ النُّقْصَانَ مِنْ نَفْسِهِ فَهُوَ فِي نُقْصَانٍ وَمَنْ كَانَ فِي نُقْصَانٍ فَالْمَوْتُ خَيْرٌ لَهُ طبع دار الكتاب العربی۔

زندگی کا سرمایہ پگھل رہا ہے

لیکن عمر گزری جارہی ہے اور عمر کے لمحات گزر رہے ہیں، پچھلے اتوار کو جو میں نے عرض کیا تھا، کہ ایک ایک گھڑی جو گزر رہی ہے زندگی کی، وہ ہمارا سرمایہ پگھل رہا ہے، گھٹ رہا ہے، رفتہ رفتہ، دم بدم ہمارا سرمایہ گھٹتے گھٹتے ایک دن ختم ہوجائے گا اور پتا بھی نہیں چلے گا، تو اس لیے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ چلتے ہوئے اس نظام میں رک کر ٹھہر کر یہ سوچیں کہ ہمارے اندر کیا بہتری آسکتی ہے، کیا آنی چاہیے؟ اپنا جو زندگی کا ڈھب گزر رہا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں؟ یہ اصلاح کی فکر پیدا کرنے کے لیے کچھ وقفہ چاہیے، یہ وقفہ کرنے کے لیے یہ سلسلہ ہم نے شروع کیا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے سب مل کر غور کریں، سوچیں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں، اگر نہ کریں تو زندگی کا پہیہ تو چل رہا ہے، چلتا رہے گا اور اسی غفلت میں اللہ بچائے، وقت گزرتا چلائے جائے گا، عمر ختم ہوتی چلی جائے گی۔ ہمارے حضرت والا حضرت عارفی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ۔

میں دیکھتا ہی رہ گیا نیرنگِ صبح و شام
عمرِ فسانہ ساز گزرتی چلی گئی

تو عمریں فنا گزرتی چلی جارہی ہیں کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ گھٹ رہا ہے۔ تھوڑا سا بیٹھ کر ہم غور کرلیں کہ ہم اپنے اندر کیا بہتری لائیں، کیا بہتری لانے کی ضرورت ہے؟

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول

اس مقصد کے لیے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی باہم بیٹھ کر تذکرے

کرتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بڑے مشہور صحابی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے صحابی ہیں تو ان کا مقولہ صحیح بخاری میں منقول ہے کہ

"اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً"(۱)

ہمارے ساتھ بیٹھو کچھ دیر ایمان کی باتیں کریں۔

حالانکہ وہ بھی صحابہ کرام ہیں، وہ بھی سارا دن ان ہی کاموں میں مشغول تھے، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایمان کی بات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر مزید ترقی کیسے پیدا کی جائے، مزید اصلاح کیسے لائیں؟ یہ بات کریں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں یاد کریں، ان کا تکرار کریں اور اس کے ذریعے اپنی زندگی میں بہتری لانے کی کوشش کریں، یہ ہے بھائی مقصد، نہ کوئی کتاب کا درس ہے، نہ کسی کتاب کے پڑھنے کو ظاہری طور پر کوئی ضروری سمجھا ہوا ہے کہ کتاب ضرور پڑھی جائے گی، مقصد یہ ہے کہ بیٹھ کر اپنے اندر بہتری لانے کی کوشش کریں تو اس کی بات کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے، تو اس کے لیے میں اپنے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ کی کچھ باتیں جو یاد آ جاتی ہیں عرض کر دیا کرتا ہوں گو کہ الحمد للہ اس سے بے شمار انسانوں کی زندگیوں کو فائدہ پہنچا ان کی زندگیوں میں تبدیلی آئی، ان کی زندگیوں میں انقلاب آئے، وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، ان باتوں کے اوپر عمل کرنے کے نتیجے میں، اس لیے بہانے بہانے سے وہ باتیں میں آپ حضرات کو سنایا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان پر عمل کے ذریعے ہمیں اپنے اندر اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۰/۱۔

اپنی اصلاح کی فکر کریں

تو پہلی بات جس کی حضرتِ والا تاکید فرمایا کرتے تھے وہ یہ ہے کہ بھائی اپنی اصلاح کی فکر اس طرح پیدا کرو کہ ہر لمحے میں، اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں اللہ جل جلالہ کو اپنا حال پیش کیا کرو۔ اور فرماتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ یہ جو ہم سورۂ فاتحہ میں پڑھتے ہیں کہ اے اللہ! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، آپ ہی کی مدد مانگتے ہیں، آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں، ہمارے حضرتِ والا فرمایا کرتے تھے کہ یہ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ہے، سورۂ فاتحہ جو سکھائی گئی ہے وہ یہ کہنے کے لیے سکھائی گئی ہے، کہ اے اللہ! ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اپنے اندر اصلاح لانے کا طریقہ

تو ہمارے حضرت یہ فرماتے تھے کہ سب سے پہلا کام یہ کرو کہ اپنی اصلاح کے لیے اپنے اندر بہتری لانے کے لیے ازخود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک دن بیٹھ جاؤ اور اس نیت سے بیٹھ جاؤ کہ میں اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ سے فریاد کروں گا، اپنی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ سے فریاد کروں گا۔ اللہ کے لیے نماز تو پڑھ رہے ہو نا پانچ وقت کی نماز پڑھ رہے ہو نہ؟ لیکن کس طرح پڑھ رہے ہو؟ میں بھی جانتا ہوں آپ بھی جانتے ہو، الحمد للہ پڑھ تو لیتے ہیں یہ بھی اللہ کی نعمت ہے، لیکن دل کہیں، دماغ کہیں، خیال کہیں، خیالات کہیں اس طرح نمازیں ادا ہو رہی ہیں، ایک دھیان کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ فریاد کرو، کیا فریاد کرو؟ یہ فریاد کرو کہ یا اللہ! میں اس دنیا میں جی رہا ہوں یہاں چاروں طرف اللہ بچائے فسق و

فجور کا بازار گرم ہے، الحاد اور بے دینی کی فضا پھیلی ہوئی ہے، شیطانی جال پھیلے ہوئے ہیں، نگاہوں کو پناہ نہیں ملتی، گناہوں کا جہنم دہکا ہوا ہے، العیاذ باللہ العظیم، میں اس میں اپنے آپ کو آپ کی رضا کے مطابق بنانا چاہتا ہوں، جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا بنانا چاہتا ہوں اور میں اپنے عیوب کی اصلاح چاہتا ہوں، گناہوں سے بچنا چاہتا ہوں، آپ کے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنا چاہتا ہوں، لیکن میری ہمت جواب دے رہی ہے، میں اس ماحول میں اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کر رہا ہوں۔

آپ نے فرمایا ہے کہ یہ کہا کرو کہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" میں آپ کی بارگاہ میں اسی آپ کے سکھائے ہوئے کلمے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کہہ کر میں آپ سے یہ فریاد کرتا ہوں کہ یا اللہ! اس ماحول میں گناہوں سے بچنے کی، اپنے دین پر صحیح چلنے کی، آپ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرما، یہ مانگو اللہ سے سب سے پہلے اور اے اللہ! میرے ہر دن کو پچھلے دن سے بہتر بنا اپنی رضا کے مطابق "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے حوالے سے اور "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کے حوالے سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرو، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات یاد آئی ہے فرماتے تھے اور بالکل برحق فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو الفاظ دعا کے قرآن میں سکھا دیے فرمایا کہ یوں کہو تو ان الفاظ سے جب آدمی اخلاص کے ساتھ مانگے گا، وہ دعا ضرور بالضرور قبول ہوگی، وہ رد نہیں ہوگی، جیسا فرمایا کہ

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ (۱)

یہ فرمایا کہ یوں کہوں کہ:

---

(۱) سورۃ المؤمنون آیت (۱۱۸)۔

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ نے خود سکھایا اس دعا کو تو اگر قبول کرنا نہ ہوتا تو ہم سے کہتے ہی کیوں؟ کہ تم مانگو ان الفاظ کے ساتھ مانگو، جب سکھا رہے ہیں کہ یہ کہو رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ تو پھر تو معنیٰ یہ ہیں کہ منظور ہے، اللہ تعالیٰ کو مغفرت بھی منظور ہے، رحمت بھی منظور ہے جو الفاظ اللہ تعالیٰ سکھا رہے ہیں، ہو نہیں سکتا کہ سکھا کہ ہمیں مایوس کر دیں، یہ تو مذاق ہوگا ۔العیاذ باللہ۔ کہ کوئی آدمی کسی فقیر کو یوں کہے کہ تم مجھ سے آ کے مانگو اور پھر جب وہ مانگے تو کہے کہ بھاگ جاؤ، نہیں تمہاری بات نہیں مانوں گا، تو کوئی شریف آدمی ایسی بات کہہ نہیں سکتا، اللہ جل شانہ کے بارے میں کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہمیں سکھائیں بھی کہ یوں مانگو اور پھر رد بھی فرما دیں، وہ رد نہیں فرمائیں گے، لہٰذا جو جو الفاظ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں سکھائے ہیں، ان کے ذریعے سے دعا مانگنے میں قبولیت کا سو فی صد یقین ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ سے، تو جب یہ کہو گے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور اس کے حوالے سے مانگو گے اللہ تبارک وتعالیٰ سے کہ یا اللہ! میں تو آپ کے دین کے اوپر چلنا چاہتا ہوں، آپ کی رضا کے مطابق زندگی چاہتا ہوں مجھے اس کی توفیق عطا فرما دے۔ ان شاء اللہ وہ کبھی رد نہیں ہوگی کبھی مانگا بھی؟

آخرت سے پہلے دنیا میں اپنا حساب کرلو

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کبھی مانگا بھی اس طرح؟ مانگ لو، مانگ کے دیکھو تو سہی اور پھر مثال بھی دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دیکھو، ذرا تصور کرو اور یہ تصور کرنا کوئی اپنی طرف سے من گھڑت نہیں ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ فرمایا:

"حَاسِبُوْا أنفسكم قَبلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا فإنه أهون"(۱)

کہ اپنا حساب لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب وہاں آخرت میں لیا جائے اور یہ زیادہ آسان ہے۔

آخرت کے لیے جانا ہی ہے ہر حال میں اس سے پہلے اپنا حساب لو، تو حضرت فرماتے ہیں کہ اس کا اس طرح تصور کرو کہ میدانِ حشر قائم ہے، اللہ جل جلالہ کی بارگاہ میں پیشی ہو رہی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے سوال و جواب ہو رہا ہے، سوال ہو گا تم سے یہ کہ تم نے اپنی زندگی ہمارے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیوں نہیں گزاری؟ ہمارے فرائض و واجبات میں کیوں کوتاہی کی؟ گناہوں کا کیوں ارتکاب کیا؟ غیبت کیوں کی؟ دل آزاری کیوں کی؟ دوسرے کے دل کو دکھایا وغیرہ وغیرہ اور کیوں اپنی نگاہ کو غلط استعمال کیا؟ کیوں اپنے کانوں کو غلط استعمال کیا؟ کیوں اپنی زبان کو غلط استعمال کیا؟ یہ سوال ہو رہا ہے۔

آپ جواب میں کہہ دو کہ یا اللہ آپ نے پیدا ہی ایسے زمانے میں کیا تھا، کہ جہاں چاروں طرف گناہوں کی آگ دہک رہی تھی، چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اگر آپ نے ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پیدا کیا ہوتا تو ہم بھی ایسے ہی ہو جاتے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، ہمیں تو پیدا آپ نے ایسے زمانے میں کیا جہاں گناہوں کا بازار گرم تھا، نہ نگاہ کو پناہ میسر تھی نہ زبان کو پناہ میسر تھی، چاروں طرف کفر و الحاد کا دور دورہ تھا چاروں طرف فسق و فجور کا دور دورہ تھا، ہم اگر کوئی دین پر چلنا بھی چاہتے تو ماحول ہی خراب تھا، ماحول ہمیں دوسری طرف لے جا رہا تھا تو اس ماحول سے مجبور ہو گئے، ہم کیا کریں؟ آپ

(۱) الزهد لابن المبارك ۱۰۳/۱ (۳۰۶) طبع دار الكتب العلمية۔ والزهد لابن حنبل ص ۹۹ (۶۳۳) طبع دار الكتب العلمية۔

نے پیدا ہی ایسے وقت میں کیا، دے دو جواب یہ اللہ تعالیٰ کو، تو اگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ فرمائیں کہ بھئی پیدا تو ہم نے تمہیں کیا تھا ایسے زمانے میں لیکن اگر تمہیں اس ماحول کے اندر دین پر چلنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی تو ہمیں کیوں نہیں پکارا، تم نے ہم سے کیوں نہیں کہا؟ ہم سے کیوں مدد نہیں مانگی ہم سے کیوں نہیں کہا کہ یا اللہ! مجھے چلنا دشوار ہو رہا ہے مجھے طاقت دے دیجیے مجھے ہمت دے دیجیے۔

اللہ تعالیٰ اگر یہ فرمائیں کہ میں نے تو کہہ رکھا تھا قرآن کی پہلی سورت میں، وہ سورت جو تم ہر روز نماز کے اندر پانچ دفعہ پڑھتے ہو اس میں کہہ دیا تھا کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْن اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم کی تمہیں دعا سکھائی تھی، تو تم نے ہماری بارگاہ میں یہ کیوں نہیں مانگی؟ اس کا کیا جواب ہے؟ بتاؤ چلو کس نے تمہاری زبان روکی ہوئی تھی؟ کس نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا؟ کہ تم ہماری بارگاہ میں آ کر ہم سے مدد نہ مانگو؟ تو اگر مدد مانگی ہوتی اخلاص سے مانگی ہوتی عقل کے نقطۂ نظر سے مانگی ہوتی تو ہم اس ماحول کے اندر بھی تمہیں ہمت دے دیتے اور کتنے اللہ کے بندوں کو توفیق دے رکھی تھی اسی زمانے کے اندر، اس فسق و فجور کے دور میں کتنوں کو دے رکھی تھی تمہیں بھی دے دیتے، تم اگر مانگتے تو ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ اس کا تو کوئی جواب نہیں ہوگا، لہٰذا حضرت فرماتے ہیں کہ پہلا کام تو یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کر کے اس سے مانگو یا اللہ! میں ایسا ہونا چاہتا ہوں مجھے بنا دے، ایک بات۔

اپنی زندگی کا جائزہ لو

پھر دوسری بات یہ کہ اس طرف چلنے کی کوشش کرو، اپنی زندگی کا ایک جائزہ

لو صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا اور اس میں دیکھو کہ میں نبی کریم ﷺ کی سنتوں سے آپ کی تعلیمات سے کتنا ہٹا ہوا ہوں، کس چیز پر عمل ہو رہا ہے کس چیز پر نہیں ہو رہا۔ اس کا جائزہ لو ایک فہرست بناؤ اپنی زندگی کے کاموں کی اور اس کے اندر دیکھو کہ میں کس سنت پر عمل کرتا ہوں، کس پر نہیں کرتا، کس تعلیم پر عمل کرتا ہوں، کس پر نہیں کرتا، میں دن میں صبح سے لے کر شام تک جو باتیں کرتا ہوں، اس میں جھوٹ تو نہیں ہوتا؟ اس میں غیبت تو نہیں ہوتی ؟ اس میں کسی کا دل تو نہیں دکھایا جاتا؟ میں جو آمدنی کما رہا ہوں واقعی حلال ہو رہی کہ نہیں؟ اگر ملازم ہو تو واقعی ڈیوٹی پوری دے رہا ہوں یا نہیں دے رہا؟ اس کا جائزہ لو اور جائزہ لے کر جہاں کوتاہی نظر آتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے کوئی قدم تو بڑھاؤ، قدم بڑھانے کی کوشش تو کرو، ٹھیک ہے عادت پڑی ہوئی بعض چیزوں کی اور اس عادت کو چھوڑنا دشوار معلوم ہو رہا ہے لیکن دنیا کے اندر کوئی کام ایسا نہیں ہے، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کا ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو جایا کرے، لہٰذا تھوڑا سا نفس کے اوپر مشقت برداشت تو کرنی پڑتی ہے ہر کام میں، اس کے لیے بھی برداشت کر لو کچھ کوشش کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو، اپنی طرف سے قدم بڑھاؤ اور اللہ سے مانگو۔ دو چیزیں ہیں، اپنی طرف سے قدم بڑھاؤ اور اللہ سے مانگو، قدم بڑھانے کا راستہ یہی ہے کہ جائزہ لیتے رہو۔

سنتوں کی ڈائری

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ بھئی! میں نے تمہارے لیے ایک ڈائری تیار کر لی ہے "اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ" ایک کتاب ہے، اس کتاب کے اندر حضورِ اکرم ﷺ کی سنتیں ساری جمع کر دی ہیں وہی ڈائری ہے اس کو اپنے سامنے رکھ لو اس میں سے کون سا عمل میں الحمد للہ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کا شکر

ہے۔ کون سا نہیں کرتا اس کے اوپر نشان لگا لو اور اس کے اوپر عمل کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے مانگو! بس یہ سیدھا سا راستہ ہے بجائے ہائے ہائے کرنے کے یہ راستہ اختیار کرو تو ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ ترقی عطا فرمائیں گے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میں نے حضرت ہی سے سنا کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ فرما رہے تھے کہ ایک دن میں اپنے گھر میں گیا تو دیکھا کہ لوکی پکی ہوئی ہے۔ کئی دن تک جب یہ دیکھا کہ روز لوکی پک رہی ہے تو میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ بھئی یہ روزانہ تم لوکی پکاتی ہو کیا وجہ ہے؟ لوکی کدو کیوں پکاتی ہو؟ اور بھی تو سالن ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میں نے کہیں کتاب میں پڑھ لیا تھا یا سن لیا تھا کہ لوکی نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند تھی تو اس لیے میں نے سودا لانے والے سے یہ کہہ رکھا ہے کہ جب تک بازار میں لوکی ملے تو لوکی ضرور لایا کرو تا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو پسندیدہ ترکاری ہے وہ گھر میں پکا کرے، اس لیے میں یہ پکا رہی ہوں۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اس خاتون نے مجھ سے یہ کہا تو میں سناٹے میں آگیا، میرے تن بدن میں ایک زلزلہ سا آگیا کہ دیکھو ایک خاتون ہے اور اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک چھوٹی سی عادی سنت کے اوپر عمل کرنے کا اتنا اہتمام ہے یہ سنت کوئی تشریعی سنت نہیں ہے، اگر کوئی ساری زندگی لوکی نہ کھائے تو کوئی گناہ نہیں ہے، کوئی ایسی سنت نہیں ہے کہ جس پر عمل کرنا لازمی ہو، یہ سنتِ عادیہ ہے اور اس کے اوپر عمل کرنے کا اس خاتون کو اتنا اہتمام ہے کہ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ بھئی جب تک وہ ملے ضرور لایا کرو تو ہم اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں طالبِ علم سمجھتے ہیں اور ہمیں نبی کریم سرورِ دو

عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کا اتنا اہتمام نہیں۔

کہتے ہیں اس خاتون کے اس قول نے مجھے اِک دم سے متنبہ کیا اور پھر میں نے تین دن متواتر یہ عمل کیا کہ اور سارے کام دھندے چھوڑ کر، ضروری کام دھندوں کے سوا باقی سارے کام دھندے چھوڑ کر تین دن تک اپنی زندگی کا جائزہ اس طرح لیا کہ احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جتنی سنتیں پڑھی تھیں، ان میں سے ایک ایک کو میں نے دیکھا کہ میں کس پر عمل کرتا ہوں، کس پر نہیں کرتا، اس کی ایک فہرست بنائی اور جس پر عمل نہیں تھا ان کے اوپر اس دن سے عمل کرنے کا عزم کرلیا، تین دن کے بعد الحمد للہ لائحہ عمل واضح ہوگیا۔ حضرت فرماتے تھے دیکھو کس طرح سبق لے رہے ہیں خود اپنی اہلیہ کے عمل سے سبق لے کر اور پھر پوری زندگی کا جائزہ لیا اور جائزہ لے کر اس کے مطابق اپنے آپ کو بدل لیا، تو اتباعِ سنت کی الحمد للہ توفیق ہوگئی۔ یہ حضرت فرماتے تھے، تو بھئی ساری بات ہے فکر کی، فکر ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پھر آسان فرما دیتے ہیں۔

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھنے کی وجہ

ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ اسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے کتاب اس لیے تیار کی ہے کہ تمہارے لیے ڈائری بن جائے یہ ایک یادداشت ہے، اس یادداشت کے ذریعے دیکھو کہ اس میں سے کس پر عمل ہو رہا ہے کس پر نہیں ہو رہا ہے، جس پر نہیں ہو رہا اس پر عمل کرنا شروع کر دو، ان شاء اللہ ترقی ہوتی چلی جائے گی اور اتباعِ سنت کے طریقے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی کہ یہ بہت کشش والا طریقہ ہے اس میں محبوبیت ہے یہ جو قرآنِ کریم میں فرمایا "اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ" (۱) اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۳۱).

کرو یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اتباع کرو میری پیروی کرو، تو کیا ہو گا؟ "یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ" اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

سنت پر عمل کرنے والا اللہ کا محبوب ہوتا ہے

تو ہمارے حضرت نقل فرماتے تھے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول جس وقت جو کوئی بندہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی سنت پر عمل کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے "یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ" اللہ تعالیٰ وعدہ فرما رہے ہیں کہ جب حضور کی اتباع کرو گے اللہ تم سے محبت کرے گا تو حضرت فرماتے تھے کہ جس سنت کی بھی توفیق ہو، مسجد میں داخل ہوتے ہوئے تم نے دایاں پاؤں رکھا، اس نیت سے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دایاں پاؤں رکھتے تھے تو دیکھو اب یہ عمل کر رہے ہو اللہ کے محبوب ہو، تم باہر نکلتے ہوئے بایاں پاؤں پہلے باہر نکالا، اس نیت سے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے تھے تو محبوب ہو تم، کسی سے تم نے خندہ پیشانی کے ساتھ بات کی، اس نیت سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سے ملتے تھے تو خندہ پیشانی سے ملتے تھے[1]، تو تم یہ عمل کر رہے ہو جس وقت اس وقت محبوب ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کے۔

محبت کی خاصیت

اور محبت کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب کو محِبّ اپنی طرف کھینچتا ہے تو جب

(۱) ملاحظہ ہو: صحیح البخاری ۲٤/۸ (٦۰۸۹) عن جریر قال ما حجبنی النبی ﷺ منذ أسلم ولا رآنی إلا تبسم فی وجھی. ومسند أحمد ۲٤٥/۲۹ (۱۷۷۰٤) عن عبداللہ بن الحارث بن جزء یقول ما رأیت أحدا کان أکثر تبسما من رسول اللہ ﷺ، وکذا أخرجه الترمذی فی "سننه" ۳۸/٦ (۳٦٤۱) وقال ھذا حدیث غریب، ومسند أحمد ٦۱/۳٦ (۲۱۷۳۲) عن أبی الدرداء قال ما رأیت أو ما سمعت رسول اللہ ﷺ یحدث حدیثا إلا تبسم.

اللہ تعالیٰ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچتے ہیں

”اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۱)“

تو اتباعِ سنت جتنا جتنا کرتے جاؤ گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے جاؤ گے اور جتنا اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو گے اتنا اللہ تعالیٰ تم کو اپنی طرف کھینچیں گے، اللہ تعالیٰ اپنی طرف بلائیں گے اور کھینچنے کا مطلب یہی ہے کہ توفیق عطا فرمائیں گے، زیادہ سے زیادہ عمل کی توفیق ہو گی یہ کرتے جاؤ تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے منزل تک پہنچا دیں گے، بس یہ مختصر سی بات ہے، دیکھنے میں چھوٹی سی لیکن حقیقت میں بہت بڑی، ہمارے تمام اکابر کا تقریبا متفقہ طریق ہے یہ۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے بے شمار راستے ہیں

صوفیائے کرام نے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے مختلف طریقے تجویز کیے ہیں، یہاں تک کہا گیا کہ طُرُقُ الْوُصُولِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالیٰ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے اتنے راستے ہیں جتنے انسانوں کے سانس، اتنے بے شمار راستے ہیں، بہت راستے ہیں لیکن صوفیاءِ کرام میں سے کسی نے کوئی راستہ اختیار کر لیا، کسی نے کوئی راستہ اختیار کر لیا اپنے شاگردوں کے لیے اپنے مریدین کے لیے لیکن ہمارے اکابر علماءِ دیوبند خاص طور سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں سب سے اعلیٰ طریقہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا جو اختیار کرنے کو فرمایا ہے اور اس پر زور دیا ہے، وہ ہے اتباعِ سنت، کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کی ہر ہر ادا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع

(۱) سورۃ الشوری آیت (۱۳).

کرنے کی کوشش کرو اور اس کو زیادہ سے زیادہ اپناؤ جتنا جتنا زیادہ کرتے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ سے مانگتے جاؤ گے تو پھر اللہ تعالیٰ خود کھینچ لیں گے تمہیں اس سنت کی اتباع کی برکت سے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ

اور حضرتِ مجددِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ ہمارے حضرت بکثرت نقل فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے ظاہری علوم کی تحصیل کے بعد باطنی علوم بھی جو حضراتِ صوفیاءِ کرام سکھایا کرتے ہیں، بڑے اہتمام کے ساتھ بڑے شوق و ذوق کے ساتھ حاصل کیے ہیں یہاں تک کہ پتا نہیں کہاں کہاں کے مقامات تک پہنچا ایسے ایسے مقامات تک پہنچا کہ جن کا میں زبان سے اظہار کروں تو لوگ پتا نہیں کیا سمجھیں لیکن ان سارے مقامات سے گزرنے کے بعد ایک دعا کرتا ہوں جو اس دعا پر آمین کہے گا ان شاء اللہ اس کی بھی مغفرت ہو جائے گی اور وہ دعا یہ کرتا ہوں کہ

یا اللہ! مجھے اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرما آمین۔

اے اللہ مجھے اتباعِ سنت ہی پر زندہ رکھ آمین۔

اور اے اللہ مجھے اتباعِ سنت ہی پر موت عطا فرما آمین۔

یہ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی ہمیں بھی توفیق عطا فرمادے کہ اس کے لیے کوشش کرلیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
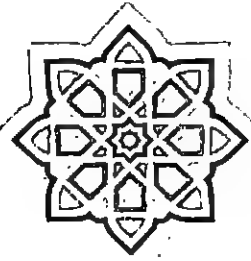
تعلیمِ قرآن کی اہمیت

(اصلاحی خطبات ۱۰/۲۴۵)
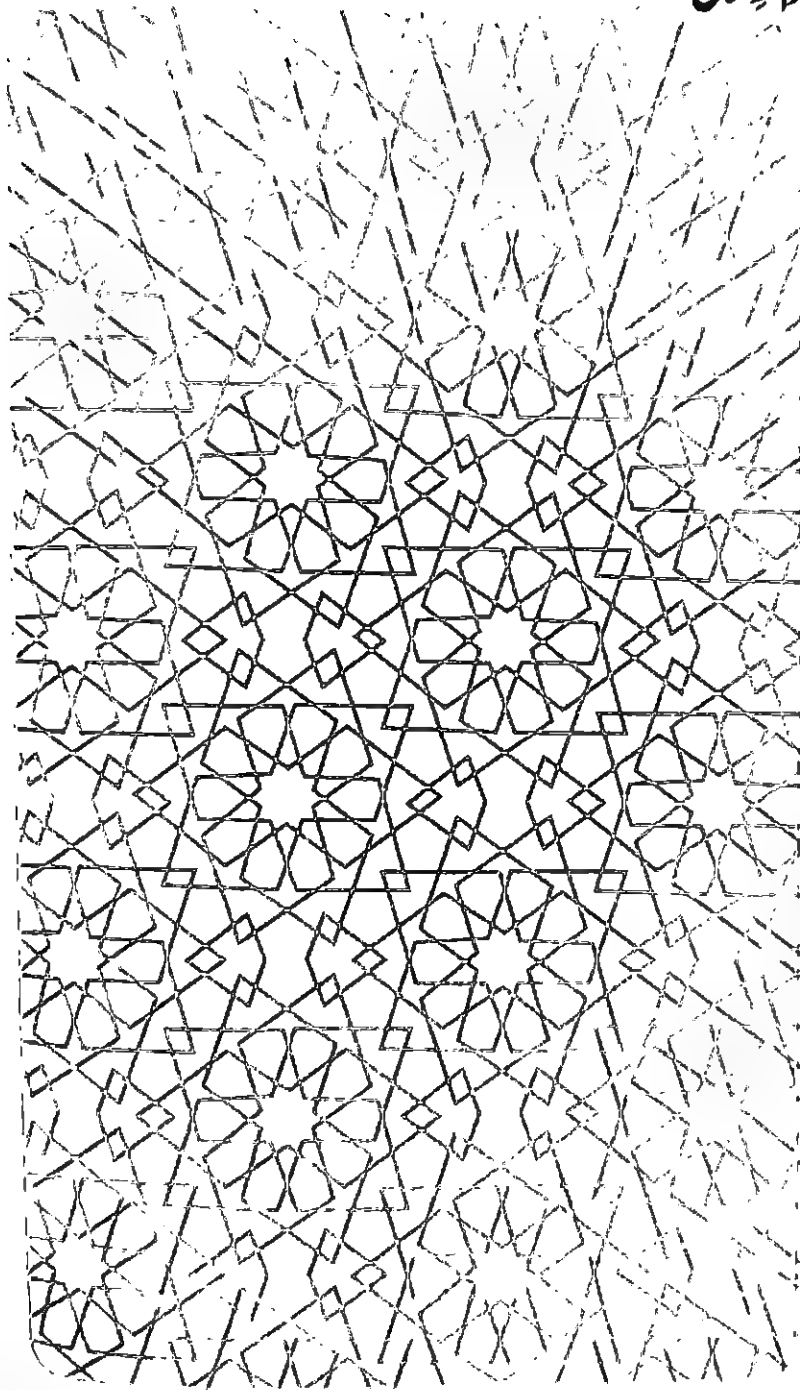
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیمِ قرآن کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا،

أما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (۱)

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱۲۱)

وَقَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:
"خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ"۔(۱)

آمَنْتُ بِاللّٰہِ صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ، وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ، وَنَحْنُ عَلٰی ذَالِکَ مِنَ الشّٰاھِدِیْنَ وَالشّٰاکِرِیْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! آج ہم سب کے لیے یہ سعادت کا موقع ہے کہ ایک دینی مدرسے کی تاسیس کی تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ ایک ایسا مدرسہ جو قرآنِ کریم کی تعلیم اور تعلّم کے لیے قائم کیا جارہا ہے، اس کی پہلی اینٹ رکھنے میں ہم سب کو شرکت کا موقع مل رہا ہے، یہ ان شاء اللہ سب کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے انوار و برکات ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

آیت کی تشریح

موقع کی مناسبت سے میں نے قرآنِ کریم کی ایک آیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث تلاوت کی ہے، ان کی تھوڑی سی تشریح اس مختصر وقت میں کرنا چاہتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ

---

(۱) صحیح البخاری ۱۹۲/۶ (۵۰۲۷)

یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ (۱)

یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی۔ کتاب سے مراد ہے اللہ کی کتاب۔ وہ لوگ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں، وہی لوگ درحقیقت اس کتاب پر ایمان لانے والے ہیں۔ یعنی صرف زبانی طور پر کتاب پر ایمان لانے کا دعویٰ کافی نہیں، جب تک کہ اس کی تلاوت کا حق ادا نہ کیا جائے۔ اس آیت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اس طرف متوجہ فرمایا کہ زبان سے تو ہر شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اللہ کی کتاب پر ایمان لاتا ہوں، لیکن جب تک وہ اس کی تلاوت کا حق ادا نہ کرے، اس وقت تک وہ اپنے اس دعویٰ ایمان میں صحیح معنی میں سچا نہیں۔

قرآنِ کریم کے تین حقوق

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآنِ کریم کے کچھ حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے اوپر مقرر فرمائے گئے ہیں۔ وہ تین حقوق ہیں؛ پہلا حق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی صحیح طریقے سے اس طرح تلاوت کرنا جس طرح وہ نازل ہوا اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلاوت فرمائی۔ دوسرا حق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور اس کے حقائق اور معارف کو اپنے دل میں اتارنا۔ تیسرا حق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کرنا۔ اگر قرآنِ کریم کے یہ تین حقوق کوئی شخص ادا کرے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے قرآنِ کریم کا حق ادا کر دیا، لیکن اگر ان تین میں سے کسی ایک حق کی ادائیگی نہ

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱۲۱)۔

کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔

تلاوتِ قرآن خود مقصود ہے

سب سے پہلا حق ہے صحیح طریقے پر تلاوت کرنا۔ آج کل لوگوں میں پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کو طوطا مینا کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ، جب تک کہ انسان اس کے معنیٰ اور مطلب نہ سمجھے اور جب تک اس کے مفہوم کا اس کو ادراک نہ ہو، اس طرح بچوں کو قرآنِ کریم رٹانے سے کیا حاصل ہے؟ (العیاذ باللہ) یاد رکھیے! یہ شیطان کی طرف سے بہت بڑا دھوکا اور فریب ہے جو مسلمانوں کے اندر پھیلایا جا رہا ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کو جن مقاصد کے لیے بھیجا گیا، قرآنِ کریم نے ان کو متعدد مقامات پر بیان فرما دیا، ان مقاصد میں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا۔ ایک طرف فرمایا:

يَتْلُواْ عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ (۱)

اور دوسری طرف فرمایا:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲)

یعنی آپ ﷺ اس لیے تشریف لائے تاکہ کتاب اللہ کی آیات لوگوں کے سامنے تلاوت کریں۔ لہٰذا تلاوت کرنا ایک مستقل مقصد ہے اور ایک مستقل نیکی اور اجر کا کام ہے، چاہے سمجھ کر تلاوت کرے یا بے سمجھے تلاوت کرے اور یہ تلاوت حضورِ اقدس ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے جس

---

(۱) سورة الجمعة آیت (۲)
(۲) أيضا

کو سب سے پہلے ذکر فرمایا:

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ

قرآنِ کریم اور فنِ تجوید

اور قرآنِ کریم کی تلاوت ایسی بے وقعت چیز نہیں کہ جس طرح چاہا تلاوت کرلیا، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو باقاعدہ تلاوت کرنے کا طریقہ سکھایا اور اس کی تعلیم دی کہ کس لفظ کو کس طرح ادا کرنا ہے، کس طرح زبان سے نکالنا ہے۔ اس کی بنیاد پر دو مستقل علوم وجود میں آئے، جن کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ہے۔ ایک علم تجوید، دوسرا علم قراءت۔ علم تجوید یہ سکھاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو پڑھنے کے لیے کس حرف کو کس طرح نکالا جائے گا اور کس حرف کو نکالنے کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے اور اس علم کے اندر وہ طریقہ بتایا گیا ہے جس طریقے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرانِ کریم پڑھا اور اس علم پر بے شمار کتابیں موجود ہیں جس میں علمائے کرام نے محنت کرکے اس علم کو مرتب کیا ہے۔ اس علم کی نظیر دنیا کی کسی دوسری قوم کے پاس نہیں ہے کہ الفاظ کی ادائیگی کے لیے کیا کیا طریقے ہوتے ہیں اور کس طرح الفاظ کو زبان سے نکالا جاتا ہے۔

یہ صرف امتِ مسلمہ کی خصوصیت ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کہ یہ علم آج تک اس طرح محفوظ ہے کہ آج پورے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جس طرح قرآنِ کریم پڑھا تھا اور جس طرح آپ پر قرآنِ کریم نازل کیا گیا تھا، الحمدللہ! اسی شکل وصورت میں وہ قرآنِ کریم آج بھی محفوظ ہے، کوئی شخص اس کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نہیں لاسکا۔

قرآنِ کریم اور علمِ قراءت

دوسرا قراءت کا علم ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ کریم پڑھنے کے کئی طریقے بھی نازل فرمادیے گئے کہ اس لفظ کو اس طرح بھی پڑھا جاسکتا ہے اور اس طرح بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کو ''علمِ قراءت'' کہتے ہیں۔ اس علم کو بھی امتِ مسلمہ نے جوں کا توں محفوظ رکھا اور آج تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔

یہ پہلی سیڑھی ہے

بہرحال! تلاوت بذاتِ خود ایک مقصد ہے اور یہ کہنا کہ بغیر سمجھے صرف الفاظ کو پڑھنے سے کیا حاصل؟ یہ شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے! جب تک کسی شخص کو قرآنِ کریم سمجھے بغیر پڑھنا نہ آیا تو وہ شخص دوسری منزل پر قدم رکھ ہی نہیں سکتا۔ قرآنِ کریم سمجھے بغیر پڑھنا پہلی سیڑھی ہے، اس سیڑھی کو پار کرنے کے بعد دوسری سیڑھی کا نمبر آتا ہے۔ اگر کسی شخص کو پہلی سیڑھی پار کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو وہ دوسری سیڑھی تک کیسے پہنچے گا۔

ہر حرف پر دس نیکیاں

اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے تو ہر حرف کی ادائیگی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں'' اور پھر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا

کہ ''میں یہ نہیں کہتا کہ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔'' لہٰذا جس شخص نے ''الٓمٓ'' پڑھا تو اس کے نامۂ اعمال میں تیس نیکیوں کا اضافہ ہوگیا۔(۱) اگرچہ بعض علماء نے تو اس حدیث کی تشریح میں یہ فرمایا کہ ''الٓمٓ'' پڑھنے پر نوے نیکیاں لکھی جائیں گی، کیوں کہ خود''الف'' تین حرفوں پر مشتمل ہے اور''لام'' بھی تین حرفوں پر مشتمل ہے اور ''میم'' بھی تین حرفوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ نو حروف ہوئے اور ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے تو اس طرح نوے نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں۔ اتنی فضیلت تلاوتِ قرآنِ کریم پر اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔

''نیکیاں'' آخرت کی کرنسی

آج ہمارے دلوں میں نامۂ اعمال میں نیکیوں کے اضافے کی اہمیت اور اس کی قدر معلوم نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دیتا کہ یہ نیک کام کرو گے تو تمہیں نوے روپے ملیں گے تو اس کی ہمارے دلوں میں بڑی قدرومنزلت ہوتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آج ہمیں ان نیکیوں کی قدر معلوم نہیں، لیکن یاد رکھیے! یہ نیکیاں ہی درحقیقت آخرت کی کرنسی ہیں۔ جب تک یہ ظاہری آنکھ کھلی ہوئی ہے اور جب تک انسان کا سانس چل رہا ہے، اس وقت تک اس نیکی کا اجر وثواب اور اس کا حقیقی فائدہ انسان کو معلوم نہیں ہوتا، لیکن جب یہ آنکھ بند ہوگی اور آخرت کا اور برزخ کا عالم شروع ہوگا تو اس وقت تم وہاں نہ تو پیسے ساتھ لے جاسکو گے اور نہ روپے ساتھ لے جاسکو گے، وہاں تو صرف یہ سوال ہوگا کہ کتنی

(۱) الزهد لابن المبارك ۲۷۹/۱ (۸۰۸) طبع دار الكتب العلمية۔ وسنن الترمذی ۳۳/۵ (۲۹۱۰) وقال هذا حديث حسن صحيح غريب من هذا الوجه۔

نیکیاں اپنے اعمال نامے میں لے کر آئے ہو؟ اس وقت ان نیکیوں کی قدر و قیمت معلوم ہوگی۔

ہم نے تلاوتِ قرآنِ کریم چھوڑ دی

بہرحال! قرآنِ کریم کی تلاوت مستقل فضیلت کا باعث اور اجر وثواب کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءِ اسلام سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ کا معمول رہا ہے کہ صبح کو بیدار ہونے کے بعد جب تک قرآنِ کریم کی تھوڑی سی تلاوت نہ کرلیتے، اس وقت تک دنیا کے دوسرے کاموں میں نہیں لگتے تھے۔ صبح کے وقت مسلمانوں کے محلے سے گزریں تو گھر گھر سے قرآنِ کریم کی تلاوت کی آوازیں آیا کرتی تھیں اور تلاوت کی یہ آواز آنا یہ مسلمانوں کے محلے کی نشانی تھی۔ افسوس ہے کہ آج ہم نے ایک طرف کفر اور شرک سے بھی آزادی حاصل کرلی اور دوسری طرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور ان کی تعلیمات سے اور دین سے بھی آزاد ہوگئے اور اب ہر سال آزادی کا جشن منایا جاتا ہے، چراغاں کیا جاتا ہے، جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں کہ ہمیں آزادی حاصل ہوگئی، لیکن ایسی آزادی حاصل ہوئی کہ اس کے بعد ہم دین سے بھی آزاد ہوگئے اور اس کے نتیجے میں نہ ہماری جانیں محفوظ ہیں، نہ مال محفوظ ہے، نہ آبرو محفوظ ہے، بلکہ فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ اسی کو ہم نے آزادی کا نام دے دیا اور اب ہماری پوری قوم یہ عذاب بھگت رہی ہے۔

قرآنِ کریم کی لعنت سے بچیں

آج قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والا نہیں ملتا اور اگر کوئی شخص قرآنِ کریم

کی تلاوت کرتا بھی ہے تو وہ اس طرح تلاوت نہیں کرتا جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے۔ حالانکہ بعض اوقات انسان تلاوت کرتا ہے لیکن قرآنِ کریم کے حروف اس کو لعنت کر رہے ہوتے ہیں۔[1] اس لیے کہ وہ قرآنِ کریم کو بگاڑ کر پڑھتا ہے اور صحیح طریقے سے پڑھنے کی فکر، دھیان اور خیال نہیں ہے۔ اگر ایک شخص آج ہی مسلمان ہوا اور وہ غلط طریقے سے قرآنِ کریم پڑھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معذور ہے، لیکن اگر کسی نے ساری عمر گزار دی پھر بھی سورۂ فاتحہ تک صحیح طریقے سے پڑھنا نہ آئی تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا عذر پیش کرے گا۔ اس لیے ہمیں اس طرح تلاوت کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا۔ یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے جس کے بغیر وہ قرآنِ کریم کا پہلا حق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرا حق اور تیسرا حق تو وہ کیا ادا کرے گا۔

ایک صحابی کا واقعہ

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمان قرآنِ کریم کے الفاظ سیکھنے کے لیے محنتیں اور مشقتیں اور قربانیاں دیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک صحابی عمرو بن سلمۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو میں اس وقت بچہ تھا اور میرا گاؤں مدینہ منورہ سے بہت فاصلے پر تھا۔ میرے قبیلے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔ ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی دولت قرآنِ کریم ہے۔

(۱) احیاء علوم الدین للغزالی ۲۷۴/۱ طبع دار المعرفۃ۔ والمدخل لابن الحاج ۹۰/۱ طبع دار التراث۔

مجھے یہ خواہش ہوئی کہ میں قرآنِ کریم کے الفاظ یاد کروں، اس کا علم سیکھوں، لیکن پوری بستی میں قرآنِ کریم پڑھانے والا کوئی نہیں تھا اور قرآنِ کریم سیکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ میں یہ کرتا کہ میری بستی کے باہر قافلوں کے گزرنے کا جو راستہ تھا، روزانہ صبح کے وقت وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا، جب کوئی قافلہ گزرتا تو میں پوچھتا کہ کیا یہ قافلہ مدینہ منورہ سے آیا ہے؟ جب قافلہ والے بتاتے کہ ہم مدینہ منورہ سے آئے ہیں تو پھر ان سے درخواست کرتا کہ آپ میں سے کسی کو قرآنِ کریم کا کچھ حصہ یاد ہو تو مجھے سکھا دیں، جن کو یاد ہوتا میں ان سے وہ حصہ یاد کر لیتا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ اس طرح چند مہینوں کے اندر میں اپنی بستی میں سب سے زیادہ قرآنِ کریم کا یاد کرنے والا ہو گیا اور سب سے زیادہ سورتیں مجھے یاد تھیں۔ چنانچہ جب میری بستی میں مسجد کی تعمیر ہوئی اور امامت کے لیے کسی کو آگے بڑھانے کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھے آگے کر دیا، اس لیے کہ سب سے زیادہ قرآنِ کریم مجھے یاد تھا۔(۱)

قرآنِ کریم اسی طرح محفوظ ہے

بہرحال! اس طرح لوگوں نے محنت اور مشقت کر کے قرآنِ کریم حاصل کیا اور انہی کی محنت اور جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج الحمدللہ! یہ قرآنِ کریم بفضلہٖ تعالیٰ صحیح شکل و صورت میں موجود ہے اور نہ صرف الفاظ بلکہ معانی بھی محفوظ ہیں۔ آج الحمدللہ پورے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی وہ صحیح تفسیر جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر ہم تک پہنچی ہے وہ اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ ہے، اس میں کوئی تغیر

(۱) صحیح البخاری ۱۵۰/۵ (٤٣٠٢).

اور تبدیلی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کے الفاظ کی حفاظت کا انتظام فرمایا ہے، اسی طرح اس کے معانی کی حفاظت کا بھی انتظام فرمایا ہے۔

عربی لغت کی حفاظت کا ایک طریقہ

معانی کی حفاظت کس طرح فرمائی؟ اس کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک بزرگ اور عالم گزرے ہیں علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "معجم البلدان" اس کتاب میں انہوں نے اپنے زمانے تک کے مشہور شہروں کے حالات اور ان کی تاریخ بیان فرمائی ہے۔ گویا کہ یہ جغرافیہ اور تاریخ کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے لکھا ہے کہ جزیرۂ عرب میں دو قبیلے تھے: ایک کا نام عکاظ اور دوسرے کا نام ضرائب تھا۔ ان دونوں کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی مہمان دوسرے شہر اور دوسری بستی کا ان کے قبیلے میں آتا تو یہ لوگ اس مہمان کو اپنے یہاں تین دن سے زیادہ ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ اہل عرب بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور مہمان کی آمد پر خوشیاں مناتے ہیں، لیکن عکاظ اور ضرائب کے قبیلے کے لوگ مہمان کو اپنے یہاں تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مہمانوں کو تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنے دیتے؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ اگر کوئی باہر کا آدمی ہمارے یہاں تین دن سے زیادہ ٹھہر جائے گا تو وہ ہماری زبان خراب کر جائے گا اور زبان سے الفاظ کی ادائیگی کے طریقے، زبان کا مفہوم، زبان کے مختلف الفاظ کے معانی اور ان کے طریقۂ استعمال میں وہ شخص اثر انداز ہوجائے گا اور ہماری زبان کو تبدیل کردے گا اور ہماری زبان قرآن

کریم کی زبان ہے لہٰذا اس زبان کو محفوظ رکھنا ضروری ہے، اس وجہ سے ہم کسی مہمان کو تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے الفاظ اور اس کے معانی کو محفوظ رکھا۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کے لیے بچوں کا چندہ

آج قرآنِ کریم اور اس کے تمام علوم پکی پکائی روٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس قرآنِ کریم کو اور اس کے علوم کو حاصل کریں اور اس کو اپنی زندگی کے اندر داخل کریں۔ ہمارے ملک اور شہر میں بہت سے مدارس اور مکاتب قائم ہیں جن کے اندر قرآنِ کریم کی تعلیم اور تعلّم کا انتظام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس جگہ پر بھی ایک مدرسے کے قیام کا انتظام ہوا ہے اور اس کے لیے یہ جگہ مختص کی گئی ہے۔ بہت سے مدرسے قائم ہوتے رہتے ہیں اور ان کے لیے چندے بھی بہت کیے جاتے ہیں، لیکن جب بھی کسی مدرسے کے لیے چندے کا معاملہ سامنے آتا ہے تو مجھے اپنے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ لوگ مدرسے کے لیے پیسوں کے چندے کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں، حالانکہ پیسوں کا چندہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا، کیوں کہ میرا یہ تجربہ ہے کہ جب ایک کام اخلاص کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیب سے اس کی مدد فرماتے ہیں اور اس کا انتظام فرماتے ہیں۔

اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہے اور اس وقت جتنے مدارس چل رہے ہیں، ان سب کے اندر جا کر کھلی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں حالانکہ وہاں کوئی اپیل نہیں ہے، کوئی چندہ نہیں ہے، کوئی سفیر نہیں ہے۔ اگر کام کے اندر اخلاص ہو

تو اللہ تعالیٰ عطا فرما ہی دیتے ہیں، لیکن مدارس کے لیے اصل چندہ بچوں کا چندہ ہونا چاہیے۔ اب اگر قائم کرنے والوں نے مدرسے تو قائم کردیے اور اس پر پیسے بھی خرچ کردیے، عمارتیں بھی کھڑی کردیں اور درس و تدریس بھی شروع ہوگیا، لیکن یہ سب ہونے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ مسلمان اس مدرسے میں اپنے بچوں کو بھیجنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ مسلمان اپنے بچوں کو اس لیے بھیجنے کے لیے تیار نہیں کہ مدرسے میں بھیجنے سے نیکیاں ملتی ہیں اور دوسری جگہ بھیجنے سے روپے ملتے ہیں، تو روپے کے مقابلے میں نیکیوں کو ترجیح کس طرح دیں۔

مدرسہ عمارت کا نام نہیں

بہرحال! یہ مدرسہ تو قائم ہورہا ہے، لیکن مدرسہ عمارت کا نام نہیں، مدرسہ جگہ اور پلاٹ کا نام نہیں، مدرسہ درس گاہ کا نام نہیں، بلکہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کا نام مدرسہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا نام تو آپ سب نے سنا ہوگا، اتنی بڑی دینی درس گاہ، لیکن جب وہ قائم ہوا تو اس وقت اس کی نہ کوئی عمارت تھی، نہ کوئی کمرہ تھا، بلکہ ایک انار کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ایک استاد اور ایک شاگرد نے پڑھنا پڑھانا شروع کردیا اور اس طرح ''دارالعلوم دیوبند'' قائم ہوگیا اور یہی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک چبوترے پر پہلا مدرسہ قائم فرمایا اور ایک ''صفہ'' پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آکر جمع ہوگئے اور دنیا کا عظیم الشان مدرسہ قائم ہوگیا۔

اور اگر مدرسہ تو قائم ہوگیا لیکن سارے محلے کے لوگ اس سے غافل ہیں، نہ تو خود قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کرنے کو تیار ہیں اور نہ بچوں کو اس میں بھیجنے کے لیے تیار ہیں، تو اس طرح مدرسے سے کماحقہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس

لیے آپ حضرات سے میری گزارش یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس مدرسے کے ساتھ مالی تعاون فرمائیں بلکہ ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش کریں کہ لوگوں کے دلوں میں قرآنِ کریم سیکھنے اور پڑھنے کا اہتمام پیدا ہو اور اپنے بچوں کو بھیجیں اور جن بڑوں کا قرآنِ کریم صحیح نہیں ہے وہ اپنے قرآنِ کریم صحیح کرنے کا اہتمام کریں۔ اگر یہ کام ہم نے کرلیا تو ان شاء اللہ یہ مدرسہ بڑا کامیاب اور مفید ہوگا اور ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس مدرسے کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس مدرسہ کے قیام میں جن لوگوں نے محنت اور کوشش کی ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے اور اس مدرسہ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور مسلمانوں کو اس مدرسہ سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

نزولِ قرآن

(نشری تقریریں ص ۲۳)
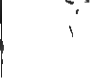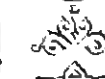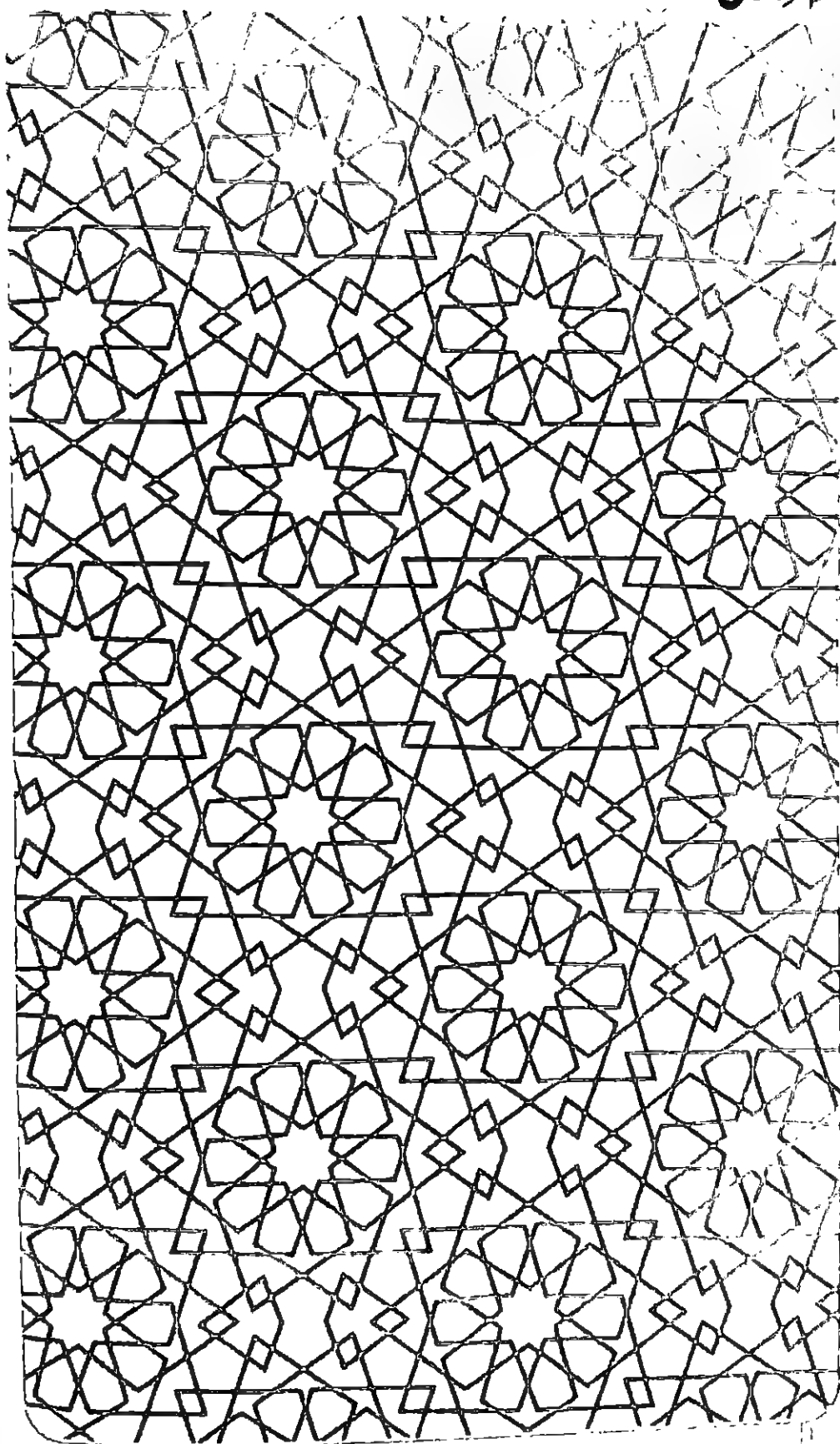
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نزولِ قرآن

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ، أما بعد!

رمضان کا مبارک مہینہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا موسمِ بہار ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کو جو خصوصیات عطا فرمائی ہیں اور اسے جن انوار و برکات سے نوازا ہے، ان کا ٹھیک ٹھیک شمار انسان کے لیے ممکن نہیں، لیکن اگر رمضان کو کوئی اور فضیلت حاصل نہ ہوتی تو یہی فضیلت اس کی عظمت کے لیے کافی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآنِ کریم نازل کرنے کے لیے منتخب فرمایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کی خصوصیات بیان فرماتے ہوئے سب سے پہلے اسی خصوصیت کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (۱)

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱۸۵).

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا۔

پھر نزولِ قرآن کے لیے رمضان کے مہینے میں بھی ایک ایسی رات کا انتخاب کیا گیا جسے اس مبارک مہینے کی روح اور اس کی برکات کا عطر کہنا چاہیے، یعنی لیلۃ القدر، چنانچہ ارشاد ہے:

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ۝ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝

بلاشبہ ہم نے یہ قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے؟ لیلۃ القدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

یوں تو قرآنِ کریم ہمیشہ سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا اور حضورِ اقدس ﷺ پر اس کا نزول ایک ہی مرتبہ نہیں ہوا، بلکہ ۲۳ سال کی مدت میں ضرورت اور حالات کے مطابق اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جاتا رہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو یہ خاص اعزاز عطا فرمایا کہ آنحضرت ﷺ پر اس کا نزول شروع کرنے سے پہلے اسے یکبارگی لوحِ محفوظ سے بیتِ معمور پر نازل فرمایا۔

بیتِ معمور عالم بالا میں فرشتوں کی ایک عبادت گاہ ہے اور یہاں قرآنِ کریم کو نازل فرمانے کا مقصد یہ تھا کہ آج کے دن کلامِ الٰہی کا یہ تحفہ امتِ محمدیہ کو پہنچانے کے لیے لوحِ محفوظ سے بیتِ معمور میں فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، تا کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کے مختلف حصے حسبِ ضرورت سرورِ دو عالم ﷺ تک پہنچاتے رہیں، اس طرح لوحِ محفوظ سے بیتِ معمور پر

نازل کرنے کا یہ عظیم واقعہ رمضان کے مہینے اور لیلۃ القدر میں پیش آیا۔[1]

اس کے بعد بیتِ معمور سے نبی کریم ﷺ پر نزولِ قرآن کے آغاز کے لیے بھی اسی لیلۃ القدر کا انتخاب کیا گیا۔

چنانچہ غارِ حرا میں جس رات آنحضرت ﷺ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، وہ بھی لیلۃ القدر تھی، نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ عبادت کے لیے غارِ حرا تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس مبارک غار کی تنہائیوں میں اپنے پروردگار کی عبادت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اسی غار میں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ ﷺ سے کہا کہ "اِقْرَأْ" یعنی پڑھو! آنحضرت ﷺ چونکہ اُمّی تھے، اس لیے آپ نے جواب میں فرمایا: "ماأنابقارِیء" یعنی میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس پر جبریل امین علیہ السلام نے آپ کے سینہ مبارک کو زور سے دبایا اور دوبارہ کہا کہ "اقرأ" یعنی پڑھو، آپ ﷺ پھر وہی جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں، جب تین مرتبہ ہو چکا تو جبریل امین علیہ السلام نے کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ [2]

---

(۱) تفسیر ابن ابی حاتم ۲۶۹۰/۸ (۱۵۱۲۹) طبع مکتبۃ نزار مصطفی السعودیۃ۔ وفضائل القرآن لابن ضریس ص۷۳ (۱۲۱) طبع دار الفکر۔

(۲) سورۃ العلق آیت (۱-۵)۔

پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔[1]

یہ قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیات تھیں جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئیں، اس کے بعد آپ پر نزولِ قرآن کا یہ مبارک سلسلہ تیئس سال تک جاری رہا۔ اور جس رات آپ ﷺ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا وہ رات لیلۃ القدر تھی۔[2]

قرآنِ کریم ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس عظیم الشان کام کے لیے شب قدر کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ رات اپنی فضیلت اور انوار و برکات کے لحاظ سے ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے پچھلی امتوں کے کچھ ایسے افراد کا ذکر کیا جنہوں نے طویل عمریں پائیں اور سینکڑوں سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس پر یہ خیال ہوا کہ ان لوگوں نے طویل عمریں پا کر مدت تک ثواب حاصل کر لیا۔

لیکن ہم لوگ جنہیں اتنی طویل عمریں نہیں ملیں، ان کے برابر ثواب کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ اس پر آنحضرت ﷺ نے لیلۃ القدر کے بارے میں یہ

(۱) صحیح البخاری ۷/۱ (۳) و ۱۷۳/۶ (۴۹۵۳).
(۲) تفسیر کبیر للرازی ۲۲۸/۳۲ طبع دار احیاء التراث العربی.

آیات انہیں سنائیں۔[1]

اور بتایا کہ جن لوگوں کی عمریں طویل نہیں ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رات ایسی رکھ دی ہے کہ اس میں عبادت کا ثواب ہزار مہینے کی عبادت سے بڑھ جاتا ہے اور یہ رات شبِ قدر ہے، چونکہ شبِ قدر ایک عظیم نعمت ہے جو اس امت کو عطا کی گئی ہے، اس لیے اس نعمت کے حصول کے لیے تھوڑی سی طلب اور جستجو کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی معین تاریخ بتانے کے بجائے یہ فرما دیا ہے کہ رات رمضان کے اخیر عشرے کی طاق راتوں میں سے کسی میں ہوتی ہے۔

لہٰذا رمضان کی ۲۱ ویں رات سے لے کر ۲۹ ویں تک ہر طاق رات میں شبِ قدر ہونے کا احتمال ہے۔[2] پھر ان راتوں میں بھی ۲۷ ویں شب کے لیلۃ القدر ہونے کا احتمال زیادہ ہے۔ اور متعدد روایات کی رو سے یہی وہ رات تھی جس میں نزولِ قرآن کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا، شبِ قدر میں قرآن کریم کو نازل کرنے میں ایک حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان ہر سال نزولِ قرآن جیسے اہم واقعہ کی یادگار رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اس کے حضور دعائیں کر کے اور روزہ رکھ کر منایا کریں۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ کسی عظیم الشان واقعہ کی یاد منانے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ اس کی خوشی میں صرف چراغاں کرلیا جائے یا کچھ بے

---

(۱) تفسیر ابن ابی حاتم ۳٤٥۲/۱۰ (۱۹٤۲٤) والسنن الکبری للبیہقی ۵۰٤/٤ (۸۵۲۲) طبع دار الکتب العلمیة۔

(۲) صحیح البخاری ۱٦۲/۱ (۸۱۳) و ٤۷/۳ (۲۰۲۱)۔

مقصد اجتماعات منعقد کر لیے جائیں یا اس کی یاد میں کھیل تماشے کیے جائیں، بلکہ یادگار اس طرح منائی جائے جس سے اس واقعہ کا اصل مقصد ذہن میں تازہ ہو، جس سے اس مقصد کے لیے جان و مال خرچ کرنے کا جذبہ بیدار ہو اور جس کے ذریعے اس واقعے کی اصل روح کو برقرار رکھا جاسکے۔

چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں نزولِ قرآن کی یاد منانے کے لیے چراغاں کرنے اور جلسے جلوس نکالنے کے بجائے شبِ قدر کی عبادت کا حکم دیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی اس عظیم الشان واقعے کی یاد ان رسمی مظاہروں کے ذریعے منانے کے بجائے ایک تو ہر سال اس رات میں جاگ کر اور عبادت کر کے منائی اور دوسرے ایک مرتبہ بدر کے میدان میں باطل کی کمر توڑ کر منائی۔

چنانچہ غزوۂ بدر کا عظیم الشان واقعہ بھی لیلۃ القدر میں پیش آیا (۱) جس کا تذکرہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۲)

اگر تم اس کلام پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر ایک فیصلہ کن دن نازل کیا تھا، یہ ہی دن تھا جس میں (حق و باطل کی) دو جماعتیں باہم ٹکرائی تھیں۔

(۱) سنن سعيد بن منصور ۲۱٦/۵ (۹۹۵) طبع دار الصميعى والمعجم الكبير للطبرانى ۲۲۱/۹ (۹۰۷۳)۔وقال الهيثمى فى "المجمع" ۲۷/۷ (۱۱۰۲۹) رواه الطبرانى وابراهيم لم يدرك ابن مسعود۔
(۲) سورة الأنفال (۴۱).

شب قدر سے فائدہ اٹھانے اور نزولِ قرآن کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر مسلمان اس رات جاگ کر اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، جس قدر ممکن ہو اس میں نفلیں پڑھے، قرآن کریم کی تلاوت کرے، تسبیح وذکر میں مشغول رہے، اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں مانگے اور اس بات کا عہد کرے کہ جس مقصد کے لیے قرآنِ کریم نازل ہوا تھا، اسے حاصل کرنے اور اس کی تبلیغ کے لیے اس میں اپنی جان ومال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔

ہم اہلِ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ ہمارا یہ خداداد ملک بھی رمضان کی ۲۷ ویں رات میں وجود میں آیا اور اللہ تعالیٰ نے اس اسلامی مملکت کا نقشہ زمین پر ابھرنے کے لیے وہی رات منتخب فرمائی جو قرآنِ کریم کے نزول کے لیے منتخب فرمائی تھی۔

یہ ایک عظیم سعادت ہے جو اہلِ پاکستان کو حاصل ہوئی اور اس عظیم نعمت کا شکر یہ تھا کہ ہم اس ملک میں اپنی زندگیوں کو اللہ تعالیٰ کی اس کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق بنائیں اور دین ودنیا میں سرخرو ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے ماضی میں اس نعمت کی ناشکری کرتے ہوئے اپنے درمیان ہر گناہ اور ہر برائی کو پروان چڑھایا۔

آج پھر رمضان کی ۲۷ ویں شب ہے اور ہماری بے حد وحساب بدعنوانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور توبہ کی قبولیت کا دروازہ بھی بند نہیں ہوا۔

آیئے! آج نزولِ قرآن کی اس مبارک رات میں ندامت کے آنسوؤں سے اپنی بداعمالیوں کے داغ دھوڈالیں، اپنی سابقہ شرمناک زندگی سے توبہ کریں

اور نزولِ قرآن کی یادگار اس نئے عزم اور ولولے کے ساتھ منائیں کہ آئندہ ہم اپنی زندگی کی ایک ایک نقل وحرکت کو اللہ تعالیٰ کی اس مقدس کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سنت کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

آج کی رات اپنے گناہوں سے توبہ کی رات ہے، اللہ تعالیٰ سینوں میں نئے عزائم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اگر آج ہم نے خلوص دل کے ساتھ یہ کام کرلیا تو یقین کیجیے کہ دینی اور دنیوی ترقی کی شاہراہ پر سالوں کا فاصلہ چند لمحوں میں طے ہوسکتا ہے۔

وادیٔ عشق بسے دور دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

قرآنی دستورِ حیات

(نشری تقریریں ص ۲۹)
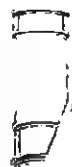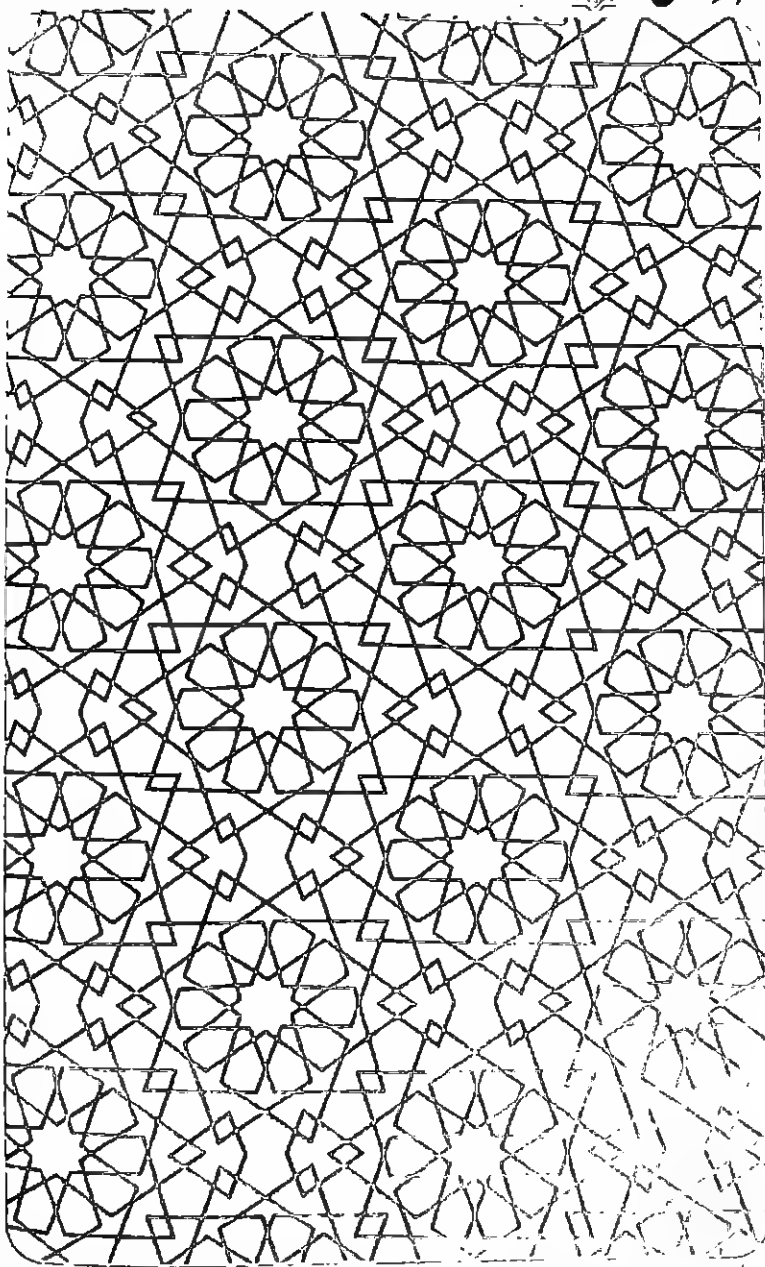
بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآنی دستورِ حیات

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

اس بات پر تو ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم ایک مکمل دستورِ حیات ہے، ایسا دستورِ حیات جس پر عمل کر کے انسان دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی اور امن و سکون کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس دعوے کی دلیل بڑی تفصیل چاہتی ہے، اس پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی گئی ہیں، آج کی نشست میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس دستورِ حیات کی بعض اہم خصوصیات پر گفتگو کریں گے۔

قرآنِ کریم نے جس دستورِ حیات کی طرف انسانیت کی راہ نمائی کی ہے، اسے خود تین مختصر لفظوں میں سمیٹ دیا ہے، ارشاد ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱)

یعنی حاکیت صرف اللہ کی ہے

---

(۱) سورۃ الانعام آیت (۵۷)۔

یہ قرآن دستورِ حیات کی سب سے پہلی، سب سے جامع اور سب سے اہم دفعہ ہے جس میں ہر شعبہ زندگی سے متعلق قرآنی ہدایات خود بخود شامل ہوجاتی ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآنِ کریم کے دیے ہوئے نظامِ زندگی سے مستفید ہونا چاہے اسے سب سے پہلے دل میں یہ حقیقت پیوست کرنی پڑے گی کہ اس کائنات میں حاکیت کا حق صرف اللہ کو ہے اور اس کے تمام بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں۔ اللہ کی یہ حاکیت اس قدر عظیم الشان، اتنی ہمہ گیر اور دائمی و ابدی ہے کہ دنیوی حکم انسانوں کی صرف ظاہری زندگی پر چلتا ہے، باطنی زندگی پر نہیں، چنانچہ دنیا کا کوئی قانون انسان کی پوشیدہ زندگی، اس کے اخلاق اور اس کے ذہن وفکر کو گرفت میں نہیں لے سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی حاکیت انسان کی ظاہری زندگی سے لے کر اس کے اخلاق و مزاج اور اس کے قلب و ذہن کے نہاں خانوں تک کو محیط ہے، زندگی کا کوئی سانس اس کی گرفت سے باہر نہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دفتر میں ہو یا بازار میں، اقتدار کی کرسی پر ہو یا عوامی اسٹیج پر، گھر والوں کے ساتھ ہو یا تنہائی میں، وہ جہاں کہیں بھی ہو اپنے ہر ہر قول وفعل اور سوچ بچار میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ
وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ [1]

اور جس بات کا تمہیں یقین نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو،
بلا شبہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز کے بارے

[1] سورۃ الاسراء آیت (۳٦).

میں یہ سوال ہوگا کہ انہیں کس کام میں خرچ کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم اور نبی کریم ﷺ کے ذریعے جو احکام دیے ہیں وہ پانچ بڑے شعبوں پر منقسم ہیں: عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق۔

عقائد کے شعبے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان حقائق کی تعلیم دی ہے، جنہیں جاننا اور دل سے ماننا اس کے مقصدِ تخلیق کے لیے ضروری ہے، مثلاً توحید، رسالت، آخرت، تقدیر، ملائکہ اور اسلام کے وہ دوسرے بنیادی عقائد جو صرف مابعد الطبیعی حقیقتوں کا اعتراف ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کی بنیاد پر ایک دلکش اور پرسکون زندگی کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ جب یہ عقائد دل میں جاگزین ہو جاتے ہیں اور انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کائنات میں حقیقی قوت صرف اللہ کی ہے، وہ ہر آن مجھے اور میرے ہر قول وفعل کو دیکھ رہا ہے اور بالآخر مجھے اپنے ہر ہر عمل کا جواب دینے کے لیے اس کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے تو اس سے خود بخود اس کا میلان برائیوں کی طرف کم اور اچھائیوں کی طرف زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسرا شعبہ ''عبادات'' کا ہے جس میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی وغیرہ داخل ہیں، ان عبادات کا مقصد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق اور رابطہ پیدا کرنا ہے۔ عقائد کے ذریعے انسان نے جن باتوں کا یقین اپنی عقل اور ذہن میں پیدا کیا تھا، یہ عبادتیں اس کو قلب وروح میں اس مضبوطی کے ساتھ پیوست کر دیتی ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ عقیدے عشق کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک سے لو لگائے، اس کے حضور سرِ نیاز خم کرے، اپنی مشکلات میں اسے پکارے اور اس کے سامنے اپنے عجز و نیاز کی

ساری پونجی لٹا دے، چنانچہ یہ عبادتیں انسان کے فطری جذبے کو تسکین دے کر اسے روحانی سرور عطا کرتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی حاکمیت کو محض ایک مجبوری سمجھ کر نہیں بلکہ عشق و محبت اور ذوق وشوق کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اسی عشق و محبت کے عالم میں پکار اٹھتا ہے کہ

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱)

بلا شبہ میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

قرآنی دستورِ حیات کا تیسرا شعبہ ''معاملات'' ہیں، یعنی وہ معاملات جو انسان اپنے دوسرے بھائیوں سے کرتا ہے جن میں خرید و فروخت، تجارت وملازمت، صنعت و زراعت وغیرہ کے معاملات بھی شامل ہیں۔ اس شعبے میں اسلام نے بڑے وسیع اور جامع احکام دیے ہیں، لیکن ان تمام احکام کا سرچشمہ قرآنِ کریم کی یہ آیت ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۲)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، الّا یہ کہ کوئی تجارت ہو جو تمہاری باہمی رضامندی سے طے پائی ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس مادہ پرست ذہنیت کی جڑ کاٹ دی ہے

(۱) سورۃ الانعام آیت (۱۶۲)۔
(۲) سورۃ النساء آیت (۲۹)۔

جو اپنے لیے مادی فوائد حاصل کرنے کی خاطر ہر جائز و ناجائز طریقے کو روا رکھتی ہے اور جس کی نظر میں پیسے سے پیسہ بنانے کا ہر راستہ انسان کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ تمہارے لیے روزی کمانا صرف جائز ہی نہیں، واجب بھی ہے، لیکن اس کی حدود مقرر کرنے کا اختیار تمہیں نہیں، اللہ کو ہے، تمہارے لیے صرف انہیں حدود میں رہ کر معاشی جدو جہد کرنا جائز ہے، جنہیں اللہ نے حلال اور حق قرار دیا ہے، اور ان حدود سے باہر کسب معاش کے جتنے طریقے ہیں وہ باطل اور ناحق ہیں اور اگر تم نے اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا ہے تو تمہارے لیے ان راستوں یا طریقوں کو اختیار کرنا کسی صورت جائز نہیں، خواہ اس میں کتنا مادی فائدہ نظر آتا ہو، چنانچہ پھر اللہ تعالیٰ نے دوسرے قرآنی احکام اور نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ذریعے ان حق اور ناحق طریقوں کی مکمل تفصیل بتا دی ہے اور ان تمام طریقوں کو ناجائز قرار دے دیا ہے جن سے دوسروں کے ساتھ دھوکا فریب ہوتا ہو یا ان پر ظلم کی گنجائش نکلتی ہو، یا جن کے ذریعے معاشرے کا صرف کوئی خاص طبقہ پھلتا پھولتا ہو اور دوسرے مصائب کا شکار ہوتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں باہمی ''معاملات'' کے متعلق قرآن و سنت کے احکام پر عمل ہوتا ہے وہاں نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح انسان لوٹتا ہے اور نہ اشتراکی نظام کی طرح اپنے متوازی اور فطری حقوق سے محروم ہوتا ہے۔

یہاں تفصیل کی تو گنجائش نہیں، لیکن اندازہ لگانے کے لیے اتنا عرض کر دینا شاید کافی ہو کہ فقہاء امت نے قرآن و سنت کے احکام کو جسے علمِ فقہ کی صورت میں مدون کیا ہے، اس کا صرف ایک چوتھائی حصہ عبادات سے متعلق ہے اور باقی

تین چوتھائی حصے میں تمام تر ''معاملات'' سے متعلق احکام پھیلے ہوئے ہیں۔

قرآنی دستورِ حیات کا چوتھا شعبہ ''معاشرت'' ہے، جس میں ایک طرف انفرادی زندگی میں اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے اوڑھنے اور سونے جاگنے کے آداب بتائے گئے ہیں اور دوسری طرح ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، عزیز و اقرباء، دوست احباب اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میل جول اور عام برتاؤ کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے، یہ بھی بڑا وسیع شعبہ ہے جس کی تفصیلات پر مفصل کتابیں موجود ہیں، لیکن اس کا بنیادی اصول سرورِ دو عالم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرما دیا ہے کہ

''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ''(۱)

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی ذات، اپنے قول وفعل یا اپنی کسی ادا سے کسی دوسرے کی تکلیف کا باعث نہ بنے، اسلام کے تمام معاشرتی احکام اسی اصول کے گرد گھومتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم اور سنتِ نبوی نے ان تمام کاموں پر قدغن عائد کر دی ہے جن سے کسی دوسرے کو ناحق تکلیف پہنچ سکتی ہو، قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق ایک انسان کو تکلیف پہنچانا پوری انسانی برادری کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ

(۱) صحیح البخاری ۱/۱۱(۱۰).

النَّاسَ جَمِيعًا(۱)

جو شخص کسی جان کے بدلے کے بغیر یا زمین کے فساد پھیلانے کی سزا کے بغیر کسی دوسرے کو قتل کرے تو گویا اس نے بیک وقت تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

قرآنِ کریم کی سورۂ حجرات میں خاص طور پر ان معاشرتی احکام کی تاکید کی گئی ہے جن میں غیبت، لڑائی جھگڑے اور تمسخر و استہزاء کی ممانعت بڑے سخت الفاظ میں کی گئی ہے۔

قرآنی دستورِ حیات کا پانچواں اور آخری شعبہ ''اخلاق'' ہے اور اس شعبے میں انسانی طبیعت کے ان نازک مسائل کو چھیڑا گیا ہے جو نہایت باریک ہونے کے باوجود زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی ظاہری زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ اس کے اندرونی اخلاق کا عکس ہوتا ہے، لہٰذا قرآنِ کریم نے ان اندرونی اخلاق سے متعلق بھی بڑے مفصل احکام دیے ہیں اور انسان پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ تواضع، ایثار، مروت، سخاوت، شجاعت، تحمل اور بردباری جیسے اچھے اوصاف سے آراستہ ہو اور تکبر، خود پسندی، غصہ، حسد، بغض، عداوت، بخل، بزدلی اور عجلت پسندی جیسے برے اخلاق سے اپنے آپ کو بچائے، یہ کام چونکہ بڑا مشکل، نازک اور باریک ہے اور محض نظریاتی تعلیم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، اس لیے قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے کہ وہ عملی طور پر لوگوں کی اخلاقی تربیت کریں اور

---

(۱) سورۃ المائدۃ(۳۲).

انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد ان کے سچے پیروکار یہ پیغمبرانہ فریضہ ادا کرتے ہیں، اس لیے اخلاقی تربیت کے لیے ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ انبیاء کے سچے متبعین کی صحبت اختیار کر کے ان سے یہ عملی تربیت حاصل کرے۔ ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھی بن جاؤ

چنانچہ اس عملی تربیت کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جو پہلے سے تربیت یافتہ ہوں اور ان کے اخلاق پاک صاف ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس قرآنی دستورِ حیات پر کما حقہٗ عمل پیرا ہونے کی توفیق بخشے اور اس کے دنیوی اور اُخروی فوائد سے مستفید فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

---

(۱) سورۃ التوبۃ آیت (۱۱۹)۔

مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر ومضامین کا موضوع وار مجموعہ
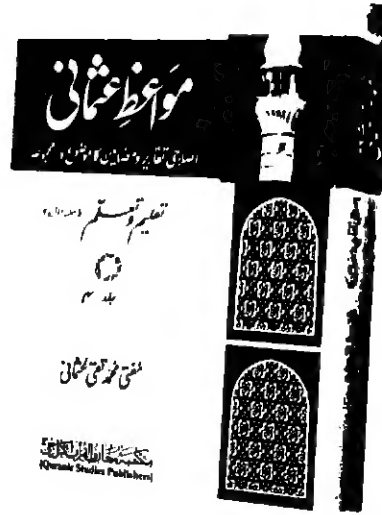
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شعب الایمان
- نشری تقریریں
- فردکی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکر وفکر
- the Islamic Months

اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریرِ ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شامل شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔

مکتبہ معارف القرآن کراچی